

ایک چٹیل کے



جرائم اور سراغ رسانی کی حیران کن روشیداو

احمد یار خان

PDFBOOKSFREE.PK



پیش لفظ

فہرست

میں آج بھی حیران ہوں

بال ایک پڑیل کے

جن بہنوں کے بھائی نہیں ہوتے

بھگوان کے بعد تم ہو

آپ نے احمد یار خان کی پہلی تصنیف ”کار، شلوار اور دوپٹہ“ پڑھائی ہوگی جس میں پانچ کہانیاں ہیں۔ ہم ان کی چار اور کہانیوں کا مجموعہ پیش کر رہے ہیں۔ ان میں بھی آپ کو وہی خوبیاں نظر آئیں گی جو پہلی کہانیوں میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ یہ بظاہر جرم اور سر اغسانی کی وارداتیں ہیں لیکن یہ ہمارے معاشرے کے اور چار دیواری کی دنیا کے ڈھکے چھپے گوشوں کے وہ ڈرامے ہیں جو پڑھو تو ہمیں چوکا دیتے ہیں مگر عملی زندگی میں جب یہ ہمارے سامنے کھیلے جاتے ہیں تو ہم چونکنے کی بجائے ان سے نگاہیں پھیر لیتے ہیں۔ ہم اپنے گناہوں کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں اور انہیں کسی اور کے گناہ سمجھ کر ان کے تذکرے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ کہانیاں آپ کی آنکھیں کھول دیں گی۔

”جرم و جاسوسی“ ایک رسوا موضوع ہے کیونکہ اس موضوع کی کہانیوں میں مجرم کی ترغیب اور فحاشی کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ اگر آپ کے بچے ان کہانیوں کے عادی ہو گئے ہیں تو انہیں احمد یار خان کی یہ دو کتابیں پڑھائیں۔ ماہنامہ ”کھایت“ میں اسی مصنف کی کہانیاں باقاعدگی سے شائع ہوتی ہیں۔ ان سے آپ کے بچوں کا نشہ بھی پورا ہو جائے گا اور وہ نہ صرف فحاشی سے بچیں گے بلکہ ان کے کردار کی بہتر نشوونما ہوگی۔

میں آج بھی حیران ہوں

عنایت اللہ

مدیر ”کھایت“ لاہور

اُس نے رشید کی جگہ خود پھانسی کے تختے پر
کھڑا ہونے کے لئے ہر وہ ثبوت اور شہادت مہیا
کی جو استغاثہ کو قابل اعتبار بنانے کے لئے درکار
تھی۔ وہ باپ تھا۔ اپنی بیٹی پر قربان ہو گیا۔

”کہاں ہیں آپ؟“

میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور اپنے گاؤں کا نام بتایا۔ میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔ پچیس سال کی سروس میں لاکھوں انسانوں سے پالا پڑا تھا۔ ان میں ملزم، مشتبہ، گواہ اور عدالتوں کے اہل کار تھے۔ کسے کسے یاد رکھا جا سکتا ہے۔

اس نے پوچھا۔ ”اب تو آپ ڈی۔ ایس۔ پی یا ایس۔ پی ہیں گے؟“

میں نے اسے بتایا کہ پاکستان بنا تو دو اڑھائی سال بعد نیشنل گنٹی تھی۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ”آپ کا چہرہ جانا پہچانا ہے یا نہیں رہا کہاں دیکھا تھا؟“

”آپ انڈیا میں ایس۔ ایچ۔ اوس تھے۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے آپ نے لالچ کے ایک ارٹیکل کے قتل کے سلسلے میں حراست میں لیا تھا۔“

”اوہ! یاد آیا۔“ میں نے کہا۔ ”پھر اصل قاتل خود ہی تھانے میں آگیا تھا اور میں نے آپ کو تفتیش سے خارج کر دیا تھا۔“ مجھے بیس سال پہلے کا یہ قتل یاد آگیا۔

”ہماری دوسری ملاقات ۱۹۴۶ میں دلی میں قائد اعظم کے جلسے میں ہوئی تھی۔“ اس نے کہا۔ ”وہ مسلم لیگ کا تاریخی جلسہ تھا۔ پھر اس نے اپنا نام بتایا۔“ میرا نام رشید ہے۔“

مجھے یہ ملاقات بھی یاد آگئی۔ میں اس عظیم جلسے میں سی آئی ڈی انسپکٹر کی حیثیت سے گیا تھا اور رشید مسلم لیگ کا ورکر تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے بیس سال پرانا قاتل کو وہ کیس یاد آگیا جس میں میں نے رشید کو مشتبہ سمجھ کر حراست میں لیا تھا۔ گرفتار نہیں کیا تھا۔

کیس یہ تھا کہ ۱۹۴۲ء کی ایک رات نوبہجے کے گاہ بگھ میں اپنے پولیس سٹیشن سے ملحق کوارڈر میں کھانا کھا رہا تھا۔ میں ایس۔ ایچ۔ اڈ تھا۔ ایک کانسٹیبل نے اگر بتایا کہ قاتل کی ایک رپورٹ آئی ہے۔ لاش فلاں ہوٹل کی دوسری منزل کے ایک کمرے میں پڑی ہے۔

بعض واقعات ایسے حیران کن ہوتے ہیں کہ سچے ہونے کے باوجود جھوٹے لگتے ہیں۔ پولیس والوں کے سامنے ایسے واقعات زیادہ آتے ہیں جو عام شہریوں کے لیے ناقابل یقین مدد محک حیران کن ہوتے ہیں۔ یہ واقعہ جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں، ایسے ہی واقعات میں سے ایک ہے۔ یہ تاریخین کے لیے شاید ناقابل یقین ہو لیکن مجھ جیسے آدمی کے لیے جس نے پولیس سروس میں پچیس سال قتل، ڈاکے اور بے شمار جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں لوگوں کے گھروں کے اندر کے اوردلوں کے اندر کے بھید بہت قریب سے دیکھے ہوں، یہ واقعہ ناقابل یقین یا حیران کن نہیں البتہ غیر معمولی ضرور ہے۔ یہ جذبات اور جذبہ ایثار کی ایک غیر معمولی مثال ہے اور یہ میرا ایک ایسا کیس ہے جس کی میں نے تفتیش مکمل کر دی تھی، قاتل کو پہچانسی دے دی گئی تھی، لیکن بیس سال بعد پتہ چلا کہ میری تفتیش مکمل نہیں تھی۔

۱۹۶۲ء کا ذکر ہے۔ پاکستان کے ایک شہر میں ایک آدمی کو دیکھا۔ شک ہو کر اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ وہ سامنے سے آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتا رہا۔ قریب آکر ہم دونوں رگب لگے۔ اس نے ہاتھ اٹکے کیا اور مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔

پر بیٹھ کے بل پرٹی تھی۔ تعین ہٹا کر دیکھا۔ دل کے مقام پر بچا تو کا زخم تھا۔ چاقو اس کے قریب پڑا تھا۔ خون بہ کر دروازے سے بھی باہر چلا گیا تھا۔ فرش پر ٹوٹی ہوئی ایک چائے دانے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اور ایک ٹوٹی ہوئی پیالی کے دو ٹکڑے ذرا دور پڑے تھے۔ کمرے میں میں نے ہر چیز کو غور سے دیکھا۔ میز کی دراز میں مقتول کی گھڑی رکھی تھی۔ ایک نوٹ پانچ روپے کا اور تین ایک ایک روپے کے سکے پڑے تھے۔ ٹرنک کا تالا بند تھا۔

میرے سامنے یہ سوال آیا، کیا یہ قتل ٹیکسی کے لیے کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب مجھے کالج کے دو طالب علموں سے جلدی مل گیا جو ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے۔ وہ خود ہی آگئے۔ کمرے کے دروازے میں آکر کھڑے ہو گئے۔ میں نے انہیں وہاں سے پلے جانے کو کہا تو ایک نے کہا۔ ہم آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ قابل شاید وہی اڑکا تھا جسے ہم نے قتل سے پہلے کھانے کے ہال سے گزر کر بالائی منزل پر جاتے دیکھا تھا۔

رہائشی کروں میں جانے کا ایک راستہ ہال میں سے تھا۔ سیڑھیاں ہال سے اوپر جاتی تھیں اور دوسرا راستہ جو مجھے دکھایا گیا وہ پچھوڑے سے تھا۔ وہ بھی سیڑھیاں تھیں۔ ان کے ساتھ کچھ بگ کھلی تھی اور دوسرا پر سے ہوٹل کے ملازموں وغیرہ کے تین بچا کمرے تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ مقتول ان کا کلاس فیلو تھا۔ تھوڑا سا بڑھاپا تھا۔ اس کالج کے ایک رٹکے کے ساتھ مقتول کی لڑائی ہوئی تھی۔ اس رٹکے کا نام رشید ہے اور وہ ہوٹل میں رہتا ہے۔ ہمارے کالج سے تھوڑی دور لڑکیوں کا کالج ہے۔ رٹکے اپنے کالج سے نکل کر لڑکیوں کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ مقتول، رفعت نام کی ایک طالبہ کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس لڑکی کا دوستانہ رشید کے ساتھ ہے۔ انہیں اکثر اکٹھے دیکھا گیا ہے۔ مقتول کا خیال تھا کہ لڑکی اچھے چال چلن کی نہیں۔ وہ اسے پھانسنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ پرسوں رشید اور مقتول کی لڑائی ہوئی تھی۔

میں دفتر میں گیا۔ ہوٹل کا مالک رپورٹ دینے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ہوٹل کی دوسری منزل پر رہائش کے گیارہ کمرے ہیں۔ تقریباً سوا آٹھ بجے ایک بیرا ایک کمرے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اسے کمرے کے اندر سے چیخ سنائی دی۔ اس نے دروازہ کھولا تو اس کی نظر فرش پر پڑی جہاں اس کمرے میں رہنے والے تھوڑا سا بڑا ایک سٹوڈنٹ فرش پر تڑپ رہا تھا اور اس کا خون بہ رہا تھا۔ اسی کی عمر کا ایک لڑکا جو اس کے پاس کھڑا تھا، بیرے کو دیکھ کر آتے آتے دروازے کی طرف دوڑا کہ بیرے کو اس کا دھکا لگا۔ بیرا گرتے گرتے بچا اور وہ لڑکا بھاگ گیا۔ بیرے نے اس کا پیچھا کرنے کی بجائے ہوٹل کے منیجر کو جانا بتایا۔ منیجر نے مالک کو بتایا۔ سب کمرے میں گئے تو لڑکا مر چکا تھا۔

میں نے دو کانسٹیبل ساتھ لیے اور ہوٹل میں پہنچا۔ وہاں سب سے پہلی خبر انیہ دیکھی کہ ہوٹل کے باہر اتنے لوگ جمع تھے کہ ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ ہوٹل کے کھانے کے ہال میں تماشائیوں کا جھوم تھا اور جب میں اوپر گیا تو رہائشی کمروں کے سامنے لوگ سر کے بالوں کی طرح جمع تھے۔ میں نے اور کانسٹیبلوں نے بڑی ہی شکل سے لوگوں کو ہٹایا۔ وہاں تو آنسو گیس پھینکنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ چند آدمی کمرے کے اندر بھی چلے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پاؤں اور انگلیوں کے نشان ملنے کا سوال ہی ختم ہو گیا تھا۔ یہ نشان قتل کی ایسی واردات کی تفتیش میں مدد دیتے ہیں جس کا جرم کوئی اور سراغ چھوڑے بغیر سبھاگ گیا ہو۔ لوگوں کو براہِ مدے میں سے ہٹایا۔ جب جھوم چلا گیا تو کمرے اور برآمدے میں خون ہی خون تھا جو تماشائی اپنی جوتیوں کے ساتھ کمرے سے باہر لے آئے تھے۔

قتل کا باعث ایک لڑکی

مقتول فرش پر پڑا تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر کا خوبو مسلمان نوجوان تھا۔ لاش فرش

گوئی کی طرح دروازے کی طرف گیا۔ اس نے بیرے کو دسکا دیا۔ اس کی ٹسے گر پڑی، ناچائے دانی اور ایک پیالی ٹوٹ گئی۔ قاتل بھاگ گیا۔ بیرا چند ریکٹڈ بعد سنبھل گیا۔ اس نے باہر آ کر شور مچایا اور لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”اگر قاتل تمہارے سامنے لایا جائے تو پہچان لو گے؟“
اس ادھیڑ عمر اندر یعنی صورتِ بیرے نے جواب دیا۔ ”حضور! اس کے پاس ایک آدمی کو ہاتھ میں چاقو لیے کھڑے دیکھا تو میں اتنا ڈرا کہ میں وہاں سے بھاگنے لگا تھا۔ مجھے ایک کے تین تین نظر آئے گئے۔ مجھے تو اس کی شکل یاد ہی نہیں رہی۔ میں نے کہہ کر تو دیا ہے کہ قاتل مقتول کی عمر کا تھا لیکن حضور! اب شک ہو رہا ہے کہ وہ شاید بڑی عمر کا تھا۔۔۔ اور حضور! ہو سکتا ہے چھوٹی عمر کا ہی ہو۔ مجھے تو اب بھی ڈر لگ رہا ہے۔“

ایک گواہی اور ملی۔ وہ بھی ہوٹل کا بئیر تھا۔ وہ بچھوڑے کی سیڑھیوں کی طرف آ رہا تھا۔ وہاں روشنی کانی نہیں تھی۔ وہ سیڑھیوں سے آٹھ دس قدم دُور تھا۔ اس نے اوپر سے شور مٹا۔ ”قتل ہو گیا۔ لڑکا مارا گیا۔“۔ اس آواز کے ساتھ ہی ایک آدمی سیڑھیوں سے بہت تیز اترتا دیکھا۔ بیرا اور تیز چلا۔ سیڑھیوں سے اترنے والا آخری سیڑھی سے زمین پر گرا اور فوراً اٹھ کر دوڑ پڑا۔ بیرے نے پکڑو۔ پکڑو۔ کاشو کیا۔ خود بھی اس کے پیچھے دوڑا لیکن وہ آدمی تیز تھا۔ غائب ہو گیا۔ یہ بئیر بھی قاتل کا حلیہ بیان کرنے سے ناصر تھا۔

بیرے پاس صرف دو سو ٹوٹنٹ رہ گئے تھے۔ ان کے بیان کی روشنی میں، میں ان کے کلاس فیلو رشید کو مشتبہ فرد کی حیثیت سے نفیث میں شامل کر سکتا تھا۔ اگر مجھے قابلِ اعتماد مزید شہادت یا موقعہ کا کوئی پکا گواہ مل جاتا تو میں مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیجنے سے پہلے رشید کو گرفتار کر لیتا۔ گرفتاری کا ابھی پورا جواز نہیں ملا تھا۔ رشید کے

رفت چو کا بہت خوبصورت لڑکی ہے اور امیر والدین کی بیٹی ہونے کی وجہ سے شوخ بھی ہے اس لیے لڑکوں کے کالج میں اس کا چرچا عام رہتا ہے۔ رشید بھی امیر کے بھائی کا لڑکا ہے۔ ان دونوں لڑکوں نے مزید بتایا کہ وہ ہوٹل میں شام کا کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے رشید کو کھانے کے ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ لڑکا اور ہال میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں پر نگاہ دوڑائی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ غصے میں ہے۔ وہ سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ دس پندرہ منٹ بعد اوپر سے کسی نے شور مچایا۔ قتل ہو گیا، لڑکا مارا گیا۔ تمام لوگ جو ہال میں کھاپی رہے تھے، دوڑتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ ان دونوں لڑکوں نے جب اوپر جا کر مقتول کو دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ اسے رشید قتل کر گیا ہے۔

قتل کی وجہ اور محرک واضح تھی۔ میں نے دونوں لڑکوں پر جرح کی۔ وہ جو کچھ جانتے تھے مجھے بتا دیا مگر وہ موقعہ و اوقات کے گواہ نہیں تھے۔ صرف گواہ تھے جو میری نفیث کے لیے بہت ضروری تھے۔ وہ مبینہ ملزم رشید کے متعلق جانتے تھے کہ ہوٹل میں رہتا ہے۔ رفت کے گھر کا انہیں علم نہیں تھا۔ لہذا ان کی شہادت رشید کی گرفتاری کے لیے کافی نہیں تھی۔ رشید کو صرف شاملِ نفیث کیا جاسکتا تھا۔

جس بیرے نے قاتل کو کمرے سے نکلنے دیکھا تھا، اس نے بیان دیا کہ مقتول کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اندر سے ایک توجیح سنائی دی اور پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی کو چاک بڑی سخت چوٹ لگی ہو اور وہ درد سے کواہ رہا ہو۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اس کے ہاتھ میں ٹسے اور ٹسے میں چائے کے برتن تھے۔ مقتول فرش پر پٹ کے بل پڑا ہوا تھا اور بل نہیں رہا تھا۔ اسی کی عمر ایک لڑکا ہاتھ میں چاقو لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ بئیر اسخت گھبرا گیا۔ اگر وہ ہوش ٹھکانے رکھتا تو قاتل کو پکڑ سکتا تھا یا دوڑ کر باہر نکلتا اور دروازہ باہر سے بند کر دیتا۔ وہ ڈر گیا۔ قاتل نے چاقو پھینک دیا اور

متعلق مجھے یہ فکر نہیں تھا کہ لاپتہ ہو جائے گا اور میں اس کا آپتہ معلوم نہیں کر سکوں گا۔ وہ سٹوڈنٹ تھا۔ اس کے کالج سے آسانی سے اس کا پتہ لیا جا سکتا تھا۔

میں نے سب کو کرنے سے نکال دیا اور دروازہ بند کر کے مقتول کی میز کی درازیں دیکھیں۔ ٹرک کی چابی دراز میں سے ملی۔ ٹرک کی چیزیں نکالی کر دیکھیں۔ مقتول کے بستر کو سو گھٹا۔ چادر اٹھا کر اچھی طرح دیکھی۔ تکیہ بہت ہی خود سے دیکھا۔ میں کسی لڑکی کا کوئی خطہ پانگ یا تکیے پر لڑکی کا ایک آدھ بال یا کسی لڑکی کے عطر کی خوشبو ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہ آئی۔ میں نے ایک اور امکان پر غور کیا۔ کیا ہوٹل کے مالک نے لڑکے کو قتل کر لیا ہے۔ اور قتل کا باعث کوئی لڑکی ہے؟

میں نے دوسرے کمروں میں رہنے والوں سے پوچھا۔ کسی نے ٹرک کا اظہار بھی نہ کیا کہ یہاں کوئی لڑکی آتی ہے مجھے خود بھی اس ہوٹل کے متعلق ایسا کوئی شک نہ تھا۔ میرے علاقے میں رہائش والے جو ہوٹل تھے ان پر میری سخت گاہ تھی۔ یہ ہوٹل اس معاملے میں صاف تھا۔ البتہ یہ ٹرک ضرور تھا کہ مقتول کے پاس کوئی کالجیٹ لڑکی آتی ہوگی جس پر ہوٹل کے مالک کی نظر ہوگی۔

میں نے ہوٹل کے مالک، دونوں بیروں اور دونوں لڑکوں کو پھانسی بیچ دیا اور کہا کہ وہاں میرا انتظار کریں۔ دوسرے کمروں میں رہنے والوں سے میں نے پوچھا کہ انہوں نے کسی کو جھانگتے دیکھا تھا؟ کسی نے بھی نہیں۔ میں نے سب کی فہرست تیار کی اور یہ بھی لکھا کہ کون کیوں، کب سے اور کب تک ہوٹل میں بیٹھا ہوا ہے اور اس کا تعلق کہاں کہاں ہے۔ اس کے بعد میں نے لاش کے متعلق کاغذات تیار کیے۔ برآمدگی کے دو گواہ بنا کر ان کے دستخط لیے۔ لاش باہر نکلائی۔ کمرہ بند کیا اور اسے کورس مہر کر دیا۔

بستر پر لڑکی کا بال، چوڑی کا ٹکڑا

یہ بیان لینے اور کاغذات تیار کرنے میں تین گھنٹے گزر گئے۔ لاش پورٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور میں رشید کے ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔ تاکہ نے وہاں تک پہنچاتے پہنچاتے بیس منٹ گادیئے۔ آدھی رات ہو گئی تھی۔ چوکیدار سے ہوٹل کے پرنٹنٹ کا پتہ معلوم کیا۔ وہ ساتھ ہو گیا۔ پرنٹنٹ کو بگایا۔ وہ ہندو تھا۔ پولیس کو دیکھ کر گھبرایا میں نے اسے تسلی دلا سادے کر بتایا کہ تھوڑا رے کے سٹوڈنٹ رشید کا کمرہ بتا دے اور خود ساتھ چلے۔

اس سے مقتول اور رشید کے متعلق پوچھا۔ اس نے کہا۔ اگر آپ مسلمان ہیں تو برا نہ مانا۔ مسلمان جاگیرداروں اور انگریزوں کے انعام غور بالوں کے مسلمان لڑکوں نے ہمارا نامک میں دم گر رکھا ہے۔ شہزادوں کی طرح رہتے ہیں۔ ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور غریب مسلمانوں کے لڑکے دیکھیں۔ تعلیم میں دھیان رکھتے ہیں لیکن امیر مسلمانوں کے بیٹے کالج اور ہوٹل میں عیش کرنے آتے ہیں۔ رشید کے متعلق مجھے کئی رپوٹیں ملی ہیں۔ اس کے کمرے میں ایک بڑی خوبصورت لڑکی آتی ہے۔ کبھی تو دو دو تین تین گھنٹے کمرے میں اس کے ساتھ رہتی ہے اور کبھی رشید اس کے ساتھ نکل جاتا ہے۔ مقتول کو بھی میں جانتا ہوں، اسی فٹاش کا لڑکا تھا۔ مجھے یہ بالکل معلوم نہیں کہ ان کی آپس میں کوئی دشمنی تھی یا نہیں۔

رشید کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ دستک دی تو دروازہ فوراً کھل گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ رشید سویا ہوا نہیں تھا۔ اس نے سچی جھادی تھی۔ میں نے ایک نظر میں اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے پاجامہ اور کرت پہن رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر بگڑا ہوا بہت صاف تھی۔

مجھے وہ مشتبہ نظر آ رہا تھا، میں نے اس کی ساری پتلونیں اس لیے غور سے دیکھی تھیں کہ ایک بے رے کے بیان کے مطابق وہ نیچے والی آخری سیڑھی سے گرا تھا۔ لہذا اس کی پتلون پر رگڑاؤ گرو کا نشان ضرور ہونا چاہیے تھا۔ تھیں یا کوٹ پر خون کا کوئی داغ یا دھبہ ہونا چاہیے تھا مگر مجھے ایسا کوئی نشان نہ ملا۔ اس کے برٹ دیکھے نیچے سے تلوے دیکھے۔ صاف تھے۔

میں اسے تھلنے لے گیا۔ اس کے کمرے کی چابی اپنے پاس رکھ لی۔ اس کی تحریر لکھ کر ہوش پرنٹڈ نٹ کو دے دی تھی اور ایک اور ضروری تحریر پر اس کے دستخط لے لیے تھے۔ اس وقت تک رشید سنبھل چکا تھا۔ ٹانگے میں وہ کبھی مجھ سے اُلجھ پڑتا کہ میں اسے بلاوجہ پریشان کر رہا ہوں اور کبھی منت سماجت کرنے لگتا کہ اسے چھوڑ دوں اس کا اس قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اسے صرف تسلیاں دیتا رہا۔ واردات کے متعلق کوئی بات نہ کی نہ پوچھی۔

تھانے میں گئے تو میں نے اسے اپنے دفتر میں اکیلا بٹھالایا اور کہا۔ ”دیکھو بیٹا! اپنے داغ سے یہ غلط فہمی نکال دو کہ تمہارے باپ کی دولت اور رسوخ تمہیں قانون کے پیچھے سے چھوڑے گا۔ بادشاہی انگریزوں کی ہے۔ یکسی مہاراجے کی ریاست نہیں۔ اگر تم غصے میں آکر قتل کر بیٹھے ہو تو مجھے صاف صاف بتا دو۔ میرے پاس ایسے طریقے موجود ہیں جن سے میں تمہیں نہایت معمولی سزا دلا سکتا ہوں ورنہ سیدھے پھانسی کے تختے پر جاؤ گے۔“

”میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ پٹو کا تیز ہو گیا۔ کہنے لگا۔“ آپ پہلے مجھے پھانسی کے تختے پر کھڑا کریں۔“

میں نے اپنے مزاج میں گرمی پیدا نہ ہونے دی اور نہ ہی میں تشدد کا قائل تھا۔ انگریز افسروں سے میں نے کچھ گریسکھ لیے تھے، وہ مشکل کے وقت میں مدد کرتے تھے۔ ایک گریہ تھا کہ تمہاری اہل کی طرح رعب نہ بھاڑو اور کوئی ٹھنڈے دلائے تو غصہ نہ کرو۔ ملزم اور مشتبہ کو

میں نے اسے مسکرا کر کہا۔ ”گجراؤ نہیں بیٹا۔ میں تمہیں گرفتار کرنے نہیں آیا۔ تمہارا ایک دوست قتل ہو گیا ہے۔ اس کے متعلق تم سے دو چار باتیں پوچھنی ہیں۔“

اس نے فوراً کہا۔ ”وہ مر گیا ہے؟“

اسے پوچھنا چاہیے تھا کہ کون۔ اودست قتل ہوا ہے؟ کہاں قتل ہوا ہے؟ کس نے قتل کیا ہے؟ اس نے یہ پوچھ کر کہ وہ مر گیا ہے، میرا شک بچھڑ کر دیا کہ قاتل ہی ہے اور اگر یہ نہیں تو اسے عام ضرور ہے۔ میں نے اسے کہا۔ ”تم نے چاقو ایسی بگڑا ہے کہ اس کے پچھنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔“

وہ سنبھل گیا بکا بکا۔ ”کیا اور ہلکا کہنے لگا۔“ میں نے اسے پراقتوارا ہے؟ آپ کس کے متعلق بات کر رہے ہیں؟ میں تو سوچتا ہوں تھا۔“ اس کا ہجر اور انداز اس کے خلاف گواہی دے رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”آج شام تم نے کون سے کپڑے پہنے تھے؟“

اس نے کمونٹی سے لٹکا ہوا ایک سوٹ اور قمیض دکھائی۔ میں نے ان کپڑوں کو اچھی طرح دیکھا، خصوصاً پتلون کو۔ پھر میں نے اس کی ساری پتلونیں دیکھیں جو اس نے میرے کہنے پر میرے سامنے رکھ دیں۔ اس کے بستر کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ شاید اس نے واردات کے وقت پہنے ہوئے کپڑے چھپا دیئے ہوں۔ بظاہر یہ باقاعدہ تلاشی نہیں تھی لیکن میں نے باتوں باتوں میں تلاشی مکمل کر لی۔ وہ واقعی بہت امیر لڑکا تھا۔ ایک ٹنٹک اور چڑے کے دو اٹیچی کیس تھے۔ کپڑوں کی الماری تھی۔ فرش پر درمی، کچھی تھی۔ میں نے اس کے نیچے بھی دیکھا۔ میو کی درازیں بھی دیکھیں۔ میں اس دوران اس سے غیر متعلق سی باتیں کرتا رہا۔ کوئی سیدھی چوٹ نہ کی اور میں اس کا انداز اور اس کے چہرے کو بھی دیکھتا رہا۔

دوستی اور ہمدردی کا جھاندر دو اور اس کی دکھتی رنگیں بچاؤ میں لے رشید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بھائی! میں نے یہ تو نہیں کہا کہ تم نے قتل کیا ہے۔ میں تو ابھی بہت سے آدمیوں سے یہی بات کہوں گا جو تمہیں کہ چکا ہوں۔ تم مسلمان کے بیٹے ہو۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ میں بلاوجہ تمہیں پریشان نہیں کراؤں گا۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گا کہ ایک مسلمان رکاوٹ بنے اور اس کے سامنے ایک لڑکی کی دوستی کے سلسلے میں قتل گئے الزام میں عدالت میں پیش کیا جائے۔ تم ذرا میری مدد کرو۔ رفعت کیسی لڑکی ہے؟ تمہارے علاوہ کسی اور کے ساتھ بھی اس کی دوستی ہے؟“

اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ مجھ سے پوچھا۔ ”آپ رفعت کو کس طرح جانتے ہیں؟“

”میں یہ بھی جانتا ہوں کہ رفعت پر تمہاری اور مقتول کی حقیقت سچی“ میں نے اسے

بتایا۔ تمہاری اور مقتول کی ہاتھ پائی بھی ہو چکی ہے۔ تم آج شام اس ہوٹل میں گئے تھے جہاں مقتول رہتا تھا۔ تم اسے قتل کر چکے تو ایک بیر انڈر آ گیا۔ تم اسے دکھا دے کہ بھاگ گئے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم آخری یہ لڑھی سے گرے تھے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم نے مجھے اپنی چھ پتلونیں دکھائی ہیں اور تم نے ساتویں پتلون کہیں چھپا دی ہے۔ تمہارے کمرے میں رفعت کے ایسے نشان موجود ہیں جنہیں تم چھپا نہیں سکتے۔ کمرے کی پائی میرے پاس ہے اور.....“ میں نے اسے کہا۔ ”مجھے مدد ایسی باتوں کا علم ہے جو تم سمجھتے ہو کہ کسی کو بھی معلوم نہیں لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ دو باتیں تم خود مجھے تفصیل سے بتا دو تاکہ میں اس تعاون کے بدلے تمہیں پھانسی اور عمر قید سے بچا سکوں؟“

اس کی آنکھیں بٹھر گئیں اور وہ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس پر تو جیسے بکتے طاری ہو گیا تھا۔ میں نے اسے پوری طرح

پچھاٹنے کے لیے پوچھا۔ ”رفعت کی سبز رنگ کی چوڑیاں تمہاری پسند ہے یا رفعت کی؟ وہ کچھ بھی نہ بولا۔ اس کی آنکھیں اور زیادہ کھل گئیں۔ میں نے کہا۔ ”گوری رنگ کی کلائی پر گرا سبز رنگ کوئی اچھی پسند نہیں۔ یہ تو دہرائی سا ذوق ہے۔ میں جب تمہاری طرح نیا نیا جوان ہوا تھا تو سمورے بالوں داہنی گورے رنگ کی لڑکی کی کلائیوں پر فیروزہ رنگ کی چوڑیاں پسند کیا کرتا تھا؟“

وہ اچانک سکتے سے بیدار ہو گیا اور بولا۔ ”آپ رفعت سے مل چکے ہیں؟ اس نے کیا کہا تھا؟“

”ابھی نہیں بتاؤں گا کہ اس نے کیا کہا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ میں اس سے مل چکا ہوں۔“ میں نے جھوٹ بولا۔ اس لڑکی کو میں نے بالکل نہیں دیکھا تھا۔ رشید کے کمرے میں جب میں نے اس کے کپڑے اور لبتز دیکھا تھا تو اس کے تکیے کے کنارے پر ایک لمبا بال نظر آیا۔ یہ ایک پولیس بین کی نظر تھی جس نے یہ بال دیکھ لیا تھا۔ کسی دوسرے آدمی کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ میں نے یہ بال رشید کی نظر بچا کر انگلیوں میں پکڑا اور اسے اس وقت غور سے دیکھا جب رشید اپنے ٹرنگ میں سے مجھے دکھانے کے لیے کپڑے نکال رہا تھا۔

بال بہت یاریک اور سمورے رنگ کا تھا۔ یہ کسی عام سی عورت کا بال نہیں تھا۔ سمورے بال ہمیشہ گورے رنگ کے انسان کے ہوتے ہیں۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ گورے رنگ کی کلائی پر سبز چوڑیاں اچھی پسند نہیں ہے۔ اس لڑکی کی چوڑیوں کا رنگ مجھے رشید کے کمرے میں ہی نظر آ گیا تھا۔ اس کے پنگ کے ایک پائے مجھے ساتھ دہی کی سلوٹ میں سبز رنگ کی لٹنی ہوئی چوڑی کا کوئی ایک انچ بگاڑا پڑا تھا۔ وہ میں نے اٹھایا نہیں صرف دیکھا تھا۔ یہ بال اور چوڑی کا ٹکڑا رفعت کا ہی ہو سکتا تھا۔ ہوٹل پر رشڈنٹ نے بتایا تھا کہ یہ لڑکی اس کے کمرے

میں آتی ہے اور دیر تک وہاں رہتی ہے۔

اور رشید کو یقین ہو گیا کہ میں اس کے کمرے میں جانے سے پہلے رفعت سے مل چکا ہوں۔
اس کا سر جھک گیا۔ میں اب اس انتظار میں تھا کہ وہ اقبالِ جرم کمرے لگے گا۔ اس نے سر اٹھایا اور کہا۔
”یقین کریں انسپکٹر صاحب، میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔“

قاتل خود آگیا

میں اپنی جرح کا اگلا گولہ داغنے ہی لگا تھا کہ برے دفتر کے دعوازے میں ایک آدمی آن
کھڑا ہوا۔ میں سمجھا کہ رشید کا کوئی عزیز ہوگا۔ میں نے رشید کو دیکھا۔ اس آدمی کو دیکھ کر رشید
چرک گیا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر بڑی صاف تبدیلی دیکھی۔ اس آدمی کی عمر مجھے بعد میں
پتہ چلا کہ بیالیس سال ہے لیکن چہرہ اتنا تکلف تھا کہ میری سراغ رسانی لگا ہوں میں زیادہ سے
زیادہ اٹھائیس سال کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ ”میں تفتیش میں مصروف ہوں۔
آپ باہر انتظار کریں۔“

باہر جانے کی بجائے وہ میری میز کے قریب آگیا اور کہا۔ ”ہٹل کے کمرے میں جو بڑا
قتل ہوا ہے اس کا قاتل میں ہوں۔“

میری تمام سر دس میں شاید یہ ایک ہی موقع آیا تھا کہ میں بوکھلایا اور مضطرب ہو گیا۔
میں نے ایسے قاتل بھی دیکھے تھے جو میری جرح سے گھبرا کر اپنا جرم مان جاتے تھے اور ایسے
قاتل بھی میرے پاس آئے جنہوں نے اپنی بیوی کو یا اس کے آشنا کو یا دونوں کو قتل کیا اور
اپنے قتل کے ساتھ تھانے میں آئے اور اقبالِ جرم کر لیا۔ ہر پولیس انسپکٹر کو خوشی ہوتی ہے

کہ تفتیش اور سراغ رسانی سے بچے مگر اس آدمی نے آکر کہا کہ میں اس رٹکے کا قاتل ہوں تو مجھے
ایسے محسوس ہوا جیسے اس آدمی نے مجھے سر کے بل پٹخ دیا ہو۔ چند سیکنڈ تو میری زبان بند رہی
جیسے میں بول بھی نہیں سکتا۔ میں دراصل رشید کو قاتل قرار دے چکا تھا اور میں اس کے اقبالِ جرم،
ثبوت اور شہادت کی فکر میں تھا۔ اس آدمی نے مجھے گمراہ کر دیا۔

تفتیش کرنے والے پولیس آفیسر کے سامنے کوئی قاتلِ اقبالِ جرم کمرے تو اسے اتنی خوشی
ہوتی ہے جیسے اس کی بے اولاد بیوی نے اچانک بچہ جن دیا ہو مگر میں اس آدمی کے اقبالِ جرم
سے معلوم نہیں کیوں خوش نہ ہوا۔ اگر کوئی آدمی تھانے میں جا کر کہے کہ میں نے ایک آدمی کو
قتل کر دیا ہے اور وہ لاش بھی برآمد کر اوسے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ پولیس اسے فوراً عدالت میں
لے جا کر سزا دلوا دے گی۔ پولیس کو استغاثہ، ثبوت، شہادت، آراء قتل وغیرہ عدالت میں پیش کرنا
پڑتا ہے۔ اگر استغاثہ کمزور ہو تو اقبالِ جرم کے بھی قاتل بری ہو جاتے ہیں۔

اچانک میرا دماغ میرے قابو میں آگیا۔ سب سے پہلے میں نے اس کی پتلون پر نظر ڈالی۔
اس کے دونوں گھٹنوں پر رگڑ کے نشان تھے اور سان پر تھوڑی تھوڑی مٹی لگی ہوئی تھی۔ میں نے
پوچھا۔ ”یہ اتنی اچھی پتلون آپ نے کہاں خراب کی ہے؟“

”میں اس رٹکے کو قتل کر کے بڑے آرام سے وہاں سے نکل چلا ہوا تھا۔“ اس نے
جواب دیا۔ ”مگر ایک بیرا اندر آگیا۔ اسے دیکھ کر میں تیزی سے بھاگا اور بیرے کو دھکا دے کر
باہر نکل گیا۔ اس کے ہاتھ میں رٹے تھے وہ گر پڑی۔ میں دوڑتا ہوا پچھوڑے کی سیڑھیوں سے
اُترا۔ آخری سیڑھی سے میں گھٹنوں کے بل زمین پر گرا۔ اوپر سے اس بیرے نے شور مچایا تو نیچے
ایک آدمی میرے پیچھے دوڑا۔ میں اُٹھ کر بھاگا اور نکل گیا۔ میں نے مٹی بہت دُور جا کر بھاری
تھی لیکن پوری طرح صاف نہیں ہوئی۔“

میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس نے میری دماغ سے چاقو نکال لیا اور پوری طاقت سے مجھ پر وار کیا۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چاقو میرے سویٹر میں لگا۔ اس نے سویٹر کی پھیٹی ہوتی جگہ دکھا کر کہا۔ ”یہ دیکھئے۔۔۔ جب اس نے مجھ پر چاقو سے حملہ کیا تو میں غصے سے پاگل ہو گیا۔ مجھے یہ بالکل خطرہ نہیں تھا کہ وہ مجھے قتل کر سکے گا۔ میں اس کے ہاتھوں قتل ہونے والا نہیں تھا۔ اس نے مجھے اتنا خمد دلایا کہ میں نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ قتل اور خودکشی ایک لمحے کے پاگل پن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ پاگل پن میرے دماغ پر غالب آ گیا تھا۔ اس نے چاقو کا دوسرا وار کیا۔ میں نے اس کی چاقو کے ہاتھ والی کلائی پکڑ لی اور اس کا بازو اتنی شدت سے مروڑا کہ چاقو اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ میں نے چاقو اٹھا کر اس کے سینہ میں اتار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ اس نے چیخ ماری۔ ایک بڑا اندر آ گیا۔ اس وقت لڑکا فرش پر اوندھے منہ پڑا تھا۔ میں نے چاقو پھینک دیا اور دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے بیرے کو دھکا دیا اور نکل گیا۔“

”قتل کی وجہ کیا تھا؟“ - میں نے پوچھا۔

”ایک لڑکی۔“

”آپ کی عمر کتنی ہے؟“

”بیالیس سال۔“

”بیالیس سال؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔ ”آپ عمر کی نسبت جوان نظر آتے ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اس عمر میں لڑکی کی خاطر قتل؟“

میں فوراً سنجیدہ ہو گیا اور پوچھا۔ ”کہیں وہ لڑکی آپ کی بیٹی یا بہن تو نہیں؟“

”میں اسے جانتا تک نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میرا دفتر لڑکیوں کے کالج کے قریب ہے۔“

میں نے دو دفعہ دفتر سے گھر کو جاتے ہوئے اس لڑکے کو ایک لڑکی کا پچھا کرتے اور اسے

اگر یہ آدمی اپنے دفاع میں بیان دے رہا ہوتا تو میں اس پرسوالوں کا جال پھینکتا۔ وہ تو اقبال جرم کر رہا تھا۔ میں نے اسے کرسی پر بٹھالیا اور اس سے پوچھا۔ ”آپ مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہیں کہ آپ کا دماغ ٹھکانے ہے اور آپ بھائی ہوش و حواس اقبال جرم کر رہے ہیں؟“

”آپ ہی بتائیں کہ یقین کس طرح دلایا جا سکتا ہے۔“ اس نے کہا۔

”آزاد قتل کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”جو آپ کر سہ سے اٹھا لائے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ایک چاقو تھا جو میرا نہیں

مقتول کا تھا۔“

میں نے اپنی میز پر رکھا ہوا چاقو جو کاغذ میں لپٹا ہوا تھا اور مجھے اس پر لگے ہوئے نشک

نخون کے کیمیائی معائنے کے لیے بھیجا تھا، کاغذ سے نکال کر اسے دکھایا۔ اس نے چاقو کا دستہ اپنی

مٹھی میں لے لیا اور کہا۔ ”جی یہی چاقو تھا۔“ اس نے چاقو مجھے دے دیا۔

یہ کوئی معمولی آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی تیلوں قیمتی تھی اور اس نے بند گے والا جو

سویٹر پہن رکھا تھا وہ بھی قیمتی تھا مگر سویٹر سامنے سے اس طرح پھٹا ہوا تھا جیسے کسی نے قینچی

سے کاٹا ہو۔ پھیٹی ہوئی جگہ تقریباً تین انچ تھی۔ میں اس سے پوچھنے لگا تھا کہ یہ سویٹر کس طرح پھٹا

ہے لیکن میری زبان پر یہ سوال آ گیا۔ ”آپ نے اسے تقریباً کتنے بجے قتل کیا تھا؟“

”ساتھ آٹھ بجے کے لگ بھگ۔“

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا۔ ”اب رات کے دو بج کر سات آٹھ منٹ ہو گئے ہیں۔ اگر آپ

کو اقبال جرم ہی کرنا تھا تو اتنی دیر سے کیوں آئے؟ اور یہاں آنے کا آپ نے فیصلہ کس

طرح کیا؟“

”میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”میں اسے سمجھانے بھانے آیا تھا۔“

”میں جو ہم پیشہ، غنیمتہ یا لوز لفتنگا نہیں ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”قتل جیسے جیسا تک جرم کے متعلق تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا لیکن وہ میرے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ ایک تو یہ پاگل پن تھا جس نے مجھ سے قتل کرایا۔ قتل کر کے مجھ پر ایک اور ہی قسم کا پاگل پن سوار ہو گیا۔ ایسی بے چینی کبھی اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ حالانکہ مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ مر گیا ہوگا۔ سنا ہے کہ لوگ جرم کے بعد شراب پیتے ہیں لیکن میں تو سرگٹ کا بھی عادی نہیں۔ شراب کبھی سونگھی نہیں۔ میں پاگلوں کی طرح سڑکوں پر پھرتا رہا۔ گیانہ بچے کے قریب مجھے خیال آیا کہ ہوٹل میں جا کر دیکھوں مر شاید وہ زندہ ہو۔ میں نے گھر جا کر انہی کپڑوں پر اور روٹ پہنا۔ سر پھینٹ بیٹھ رکھا تاکہ مجھے کوئی پہچان نہ سکے۔ ہوٹل ابھی کھلا تھا۔ کچھ لوگ ہوٹل کے باہر کھڑے اسی واقعہ کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔ ”سنا ہے یہاں کوئی جھگڑا ہو گیا تھا؟“ ایک آدمی نے جواب دیا۔ ”آپ جھگڑا کہتے ہیں۔ یہاں تو ایک جوان لڑکا قتل ہو گیا ہے۔ لاش کمرے میں پڑی ہے اور پولیس آئی ہوئی ہے۔۔۔“

”میں وہاں سے کھسک گیا۔ اپنے گھر چلا گیا۔ سونے کی ہبت کوشش کی لیکن نیند نہ آئی۔ رات کا ڈیڑھ بج گیا۔ میں اب یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ پولیس نے کیا کارروائی کی ہے۔ میں پولیس سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ میرا روادہ تھا کہ پولیس سٹیشن کے باہر کوئی آدمی ملا تو اس سے پوچھوں گا۔ مجھے بالکل یہ خیال نہیں تھا کہ آپ دفتر میں موجود ہوں گے۔ میرا تو دراصل دماغ خراب ہو گیا تھا اور میرے اندر جو بے چینی تھی وہ مجھے باہر کو دھکیل رہی تھی۔ میں یہاں تک آیا تو تھانے کے باہر وہ آدمی کھڑے تھے۔ ان سے کہا کہ سنا ہے آج ایک لڑکا قتل ہو گیا ہے۔ قاتل پکڑا گیا ہے یا نہیں؟ انہوں نے بتایا کہ پولیس قاتل کو پکڑ لائی ہے۔ میں نے پوچھا وہ کون ہے؟ انہوں نے بتایا کہ کالج کا ایک سٹوڈنٹ ہے۔۔۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل ٹہٹا تھٹا اساطے سے باہر آیا۔ ان دو

پریشان کرتے دیکھا۔ تیسری بار میں نے پھر لڑکے کو جی بدتمیزی کرتے دیکھا۔ میں پاس سے گزر رہا تھا۔ لڑکی نے مجھ سے شکایت کی۔ میں نے لڑکے کو منگ لیا تو اس نے میری بے عزتی کر دی۔ میں نے اس لڑکے کو پیٹا۔ میں کچھ جذباتی سا آدمی ہوں۔ دوسرے دن میں کالج کے قریب چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکیاں کالج سے نکلیں تو یہ لڑکا کہیں سے آگیا اور دور مبارک لڑکی کے پیچھے ہو گیا۔ میں نے جا کر لڑکے کو پکڑ لیا۔ لڑکی سے کہا کہ تم چلی جاؤ لوگوں نے پنج بچاؤ کرادیا۔ لڑکے نے مجھے گالیاں دیں اور کہا۔ ”کل تم یہاں آنا۔ تمہاری لاش یہاں سے اٹھائی جائے گی۔“ اس نے یہ بھی کہا۔ ”اگر یہ لڑکی تمہاری بیٹی ہے تو کل میں اسی سڑک پر اس کے کپڑے اتاروں گا۔“ مجھے لوگوں نے پکڑ رکھا تھا۔ لڑکا چلا گیا۔ کالج کے کچھ سٹوڈنٹ وہاں کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ بڑا ڈھیٹ اور بد معاش لڑکا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس کا گھر کہاں ہے؟ انہوں نے بتایا کہ کہیں اور کارہننے والا ہے۔ یہاں (فلان) ہوٹل میں رہتا ہے۔ ایک لڑکے نے مجھے اس کے کمرے کا نمبر بھی بتا دیا میں شام تک کوشش کرتا رہا کہ غصے پر قابو پاؤں مگر ناکام رہا۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے میں اس کے کمرے میں چلا گیا۔ اگر وہ میری بات سن لیتا تو قتل نہ ہوتا۔ اس نے مجھ پر جرات سے حملہ کر دیا۔

”تو آپ اپنے ڈیفینس کی یہ لائن اختیار کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے اسے اپنی جمان بچانے (محافظت خود اختیاری) کے لیے قتل کیا ہے؟ میں نے اس سے پوچھا۔“

”بالکل نہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میں ایسا کوئی گواہ پیش نہیں کر سکتا کہ اس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ میں نے اسے قتل کیا ہے۔“

”میں نے آپ سے یہ پوچھا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”کہ آپ کو اتنی دیر بعد اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرنے کا خیال کیسے آیا؟“

پہچاننے کے لیے قانون نے ایک طریقہ وضع کر رکھا ہے جسے شناخت پر پٹیا کہتے ہیں۔ ملزم کو سات آٹھ غیر متعلق آدمیوں میں کھڑا کر کے گواہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان میں سے ملزم کو پہچانے۔ یہ پر پٹیا ایک مجسٹریٹ کی موجودگی میں کی جاتی ہے لیکن میں نے اس طریقہ کار سے انحراف کیا۔ ایک آدمی اپنے آپ کو پہچاننے کے تحت پر کھڑا کر دیا تھا۔ مجھے یہ یقین نہ تھا کہ وہ واقعی قاتل ہے اور کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ رشید کو پہچاننے کے لیے مجھے گواہ کر رہا ہے؟۔ میں نے تمام گواہوں کو تھلنے میں بلا رکھا تھا۔ ان میں اس بیرے کو اندر بلا یا جو بیچ من مکتول کے کمرے میں گیا تھا۔

اسے کہا کہ ان دونوں درشتید اور دیم خان (کو دیکھو اور اچھی طرح سوچ کر بتاؤ کہ تم نے مکتول کے پاس کیسے دیکھا تھا۔

بیرے نے دونوں کو باری باری دیکھا اور سوچ میں پڑ گیا۔ رشید خاموش بیٹھا رہا۔ دیم نے اسے کہا۔ ”تہارے ہاتھ میں ٹرے تھی جب تم اندر آئے تھے۔ میرے دھکے سے تہاری ٹرے گرنا نہیں تھی؟“

یہ بیرا مجھے پہلے ہی کہ چکا تھا کہ وہ اتنا خرمزدہ ہو گیا تھا کہ وہ ملزم کو اچھی طرح پہچان نہیں سکا۔ اب اس نے دیم خان کو دیکھا اور اس کی بات سنی تو دھوکے سے بولا۔ ”یہی دیم خان، تھا“ میں نے اس کی شناخت کو اس لیے تسلیم کر لیا کہ دیم خان نے خود ہی اشارہ دے دیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ دیم خان نے اپنے خلاف ایک شہادت کو خود ہی پکا کر دیا۔

میں نے دوسرے بیرے کو بلایا جس نے ایک آدمی کو آخری بیڑھی سے گرتے دیکھا تھا۔ اس نے بیرے پوچھنے پر بتایا کہ اس نے چہرہ نہیں دیکھا، قدرت دیکھا تھا۔ وہاں روشنی بہت تھوڑی تھی۔ بہر حال اس کے کہنے پر دیم خان کرسی سے اٹھا۔ بیرے نے اسے دائیں بائیں ادھر دیکھ کر ٹرے ہر دیکھا اور کہا۔ ”یہی معلوم ہوتا ہے۔“

آدمیوں میں سے ایک نے اس سے پوچھا کہ قاتل یہی ہے یا اسے شک میں کپڑا ہے؟ کائٹیل نے گالی دے کر کہا کہ یہی ہے۔ ثبوت پکا مل گیا ہے۔ ابھی اس سے اقبال جرم کر لیا جائے گا۔۔۔۔۔

”میں نے یہ سنا تو میرے دماغ میں یہی خیال آیا کہ پولیس نے ایک بے گناہ کو کپڑا لیا ہے۔ ایک سٹوڈنٹ کو میں نے قتل کر دیا ہے اور دوسرا سٹوڈنٹ پکڑا گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسئی کی وجہ سے پولیس سے ڈر کر بے گناہ پھنس جاتے۔ مجھے یہ ڈر بھی محسوس ہوا کہ پولیس اس پر تشدد کر کے اس سے جھوٹا اقبال جرم کرالے گی۔ میں برداشت نہ کر سکا کہ میرے جرم کی سزا کئی اور کرلے۔ میں تھانے کے گیٹ میں داخل ہو گیا اور سیدھا آپ کے پاس آ گیا۔“

اس نے رشید کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ ”آپ نے اس رٹ کے کو کپڑا لیا ہے شاید؟۔۔۔ اسے چھوڑ دیں اور جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھیں۔“ اس نے لمبا سانس لیا اور کہا۔ ”اقبال جرم کر کے مجھے سکون محسوس ہو رہا ہے۔“

”کیا آپ کو یہ بھی احساس ہے کہ آپ کا انجام کیا ہوگا؟۔ میں نے اس سے پوچھا۔ میں نے ابھی کوئی کاغذی کارروائی آپ کے متعلق نہیں کی۔ میں آپ کو سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔“

”میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”مجھے سوچنے کا موقع نہ دیں۔“

پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا

اس آدمی نے اپنا نام دیم خان بتایا۔ وہ اپنا دفاع نہیں بلکہ اقبال جرم کر دیا تھا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس کی پتلون جو گھٹنوں سے لگڑی ہوئی تھی ثابت کر رہی تھی کہ یہی قاتل ہے۔ پھر بھی مجھے اقبال جرم کو صحیح ثابت کرنے کے لیے قابل یقین شہادت کی ضرورت تھی۔ ملزم کو

کا اقبالی بیان قلبند کر کے بیان اپنے پاس رکھ لیا۔ اس سزہ برفانے کو اب عدالت میں کھنا تھا۔ وہیم خان نے مجھے جو بیان دیا تھا اس کے مطابق میں نے گواہ اور شہرت وغیرہ اکٹھے کئے شروع کرنے۔ ہٹول کے مالک، دو بیروں، دو شیروں اور دوسری سے گواہوں کے علاوہ رفعت کو بھی گواہوں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا۔ میں نے رفعت کو پہلی بار دیکھا تو میں اس کے حسن سے چونک اٹھا۔ میرا قیاس بالکل صحیح تھا۔ اس کے بال جوڑے رنگ گورا اور اس کی چوڑیوں کا رنگ گہرا سبز تھا۔ ایک کلانی میں چارا اور دوسری میں دو چوڑیاں تھیں۔ اس نے مقتول کے متعلق بیان دیا کہ وہ اسے بہت پریشان کرتا تھا۔ وہیم خان کے اس بیان کی اس نے تائید کی کہ وہیم خان نے اسے پہلے دو تین بار روکا پھر اس کی پٹائی کی تھی۔

ان کے ساتھ پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹر کی اور اقبالی بیان قلبند کرنے والے مجسٹریٹ کی گواہی بھی تھی۔ شہرت میں جو چیزیں رکھیں ان میں اکہ قتل اور وہیم خان کی پتلون تھی جو گھنٹوں سے لگڑی ہوئی تھی۔ میں نے تین گواہ ایسی صورت کے لیے تیار رکھے تھے کہ اگر وہیم خان اقبال جرم سے معذرت ہو جائے تو پیش کر دوں گا۔

استغاثہ کو پوری طرح مضبوط کر کے بھی مجھے کچھ غلام نظر آرہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ایک خدشہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ یہ تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہیم خان رشید کو بچانے کے لیے ٹالھ کھیل رہا ہے؟ یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ رشید قتل کر کے وہیم خان سے ملا ہو اور وہیم خان نے اس سے ساری باتیں سُن کر اپنے آپ کو پیش کر دیا ہو۔ گو ایک عام شہری پولیس کو گراہ کرنے کے لیے اتنی باریکیوں کو ذہن میں نہیں لاسکتا۔ پولیس کے پاس ہر دعوے کا توڑ ہوتا ہے۔ پھر بھی ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے میرے عدل سے دوسرا نکلا نہیں اور میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر وہیم خان کا دلیل قابل ہوا تو وہ اسے شک کی بنا پر ہی کر سکتا ہے مگر

”تم اس ہوٹل میں گئے تھے۔ میں نے رشید سے کہا۔ تمہیں وہاں دیکھا گیا تھا اور تم اوپر بھی گئے تھے۔ کیوں گئے تھے؟“

”میں اس رٹکے سے ملنے گیا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”وہ رفعت کو پریشان کرتا رہتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میری اور اس کی لڑائی بھی ہوئی تھی۔ میں یہ سوچ کر اس کے کمرے میں جا رہا تھا کہ اسے دوستانہ طریقے سے سمجھاؤں گا۔ میں لڑائی جھگڑے کی نیت سے نہیں گیا تھا۔ میں ابھی اس کا کمرہ ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ کسی نے قتل، قتل، قتل، کاشمیر چلایا۔ لوگ دوڑے آئے، ڈراسی دیریں ٹال لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔“

میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے وہیم خان کو دیکھا تھا؟ اس نے جواب دیا۔ ”میں کسی کو بچان نہیں سکا۔ وہاں بہت سے لوگ دوڑے تھے۔ پھر میں نے مقتول کو دیکھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ کسی رٹکے کا بھائی یا باپ اسے قتل کر گیا ہے۔ رٹکیوں سے چھڑ چھاڑ اس کی عدالت تھی۔“

میں نے وہیم خان، رشید اور بیروں سے جو سینکڑوں سوال پوچھے اور انہوں نے جو جواب اور بیان دینے وہ میں بہت ہی اختصار سے سُنا رہا ہوں۔ اگر اپنی تفتیش کی ساری کارروائی لکھوں تو چار سو صفحات کی کتاب بن جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اتنے اختصار سے کوئی پولیس آفیسر میری تفتیش کو ناقص سمجھے لیکن مجبوری ہے کہ ہر ایک سوال اور اس کا جواب لکھنا ممکن نہیں۔ البتہ کوئی بھی پولیس آفیسر میری اس کارروائی پر اعتراض نہیں کرے گا کہ میں نے رشید کو خارج تفتیش کر دیا اور وہیم خان کو حراست میں لے لیا۔ وہیم خان اقبال جرم کر رہا تھا اور وہ اپنے خلاف شہادت بھی دے رہا تھا اور اس کا یہ اقدام کسی خوف، اندیشہ یا لالچ کا نتیجہ نہیں تھا۔ میں نے دوسرے دن وہیم خان کو ایک مجسٹریٹ کے حوالے کر دیا۔ مجسٹریٹ نے اس

انگریز تھا اور بڑا ہی ظالم اور بدعنوان تھا۔ ہندوستانیوں سے وہ نفرت کرتا تھا۔ اگر ہندوستان کی بادشاہی صرف ایک دن کے لیے اسے دے دی جاتی تو وہ ہندوستان کی تمام تر آبادی کو سزائے موت دے دیتا۔ اس کا کھٹا ہوا فیصلہ اس قدر مدلل اور پرمغز ہوتا تھا کہ اس کے فیصلوں کے خلاف بہت ہی کم اپیلیں ہائی کورٹ منظور کرتی تھی۔ دسیم خان کو بھی اس نے سزائے موت دے دی جس کا مجھے بہت افسوس ہوا۔

پولیس والوں کو کسی کی سزا بائی پر افسوس نہیں ہوا کرتا لیکن دسیم خان سے میں اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اس کی شخصیت میرے ذہن میں نقش ہو گئی۔ دسیم خان نے جب عدالت میں فیصلے کے یہ الفاظ سنے کہ اس فیصلے کے خلاف ایک ہفتے کے اندما اندر اپیل کی جاسکتی ہے تو اس نے انگریزی میں کہا۔ میں اس فیصلے کے خلاف اپیل نہیں کروں گا؟

رفت تقرر بنا ہر پیشی پر عدالت میں آتی تھی۔ رفت کا باپ اور رشید تو ہر پیشی پر ضرور موجود ہوتے تھے۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ دسیم کو مجبور کرتے رہتے تھے کہ وہ اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے۔ کچھ دن ہتا کہ میں آخر میں حجب اپنا بیان بدل گا تو تم سب حیران رہ جاؤ گے مگر اس نے سزائے موت لے کر اعلان کر دیا کہ وہ اپیل نہیں کرے گا۔ رفت کے باپ نے ایک تجربہ کار وکیل سے اپیل دائر کرائی لیکن بیکار گئی۔ ہائی کورٹ نے سزا بحال رکھی۔ پھر پچھانسی کی تاریخ مقرر ہو گئی اور دسیم خان کو پچھانسی دے دی گئی۔

قتل کا یہ کیس اتنے ہزار کیسوں میں سے ایک تھا جو پھر تھانے میں آسکا اور عدالت میں جلتے تھے۔ کوئی بری ہو جانا اور بہت سے سزائے موت یا عمر قید چاہاتے۔ یہ تو پولیس کا معمول ہوتا ہے، کیس آیا، ختم ہوا، ہمارے ذہن سے اُتر گیا اور ہم دوسرے کیس کی تفتیش میں مصروف ہو گئے لیکن دسیم خان میرے ذہن سے نہ اُترا۔ وہ مجھے کئی بار یاد آیا اور میں نے اپنے آپ میں

پہلی پیشی پر دسیم خان وکیل کے بغیر عدالت میں لایا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ اقبال محرم کر چکا ہے، اس لیے صفائی کے لیے وکیل نہیں لانا چاہتا۔ مجھٹریٹ نے اسے کہا کہ وکیل ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے ایک وکیل لے لیا وکیل نے پہلی پیشی کے بعد استغاثہ کا جانہ لیا تو اسے کہا کہ وہ اپنے اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے کیونکہ استغاثہ کمزور ہے اور وہ اسے شک کا فائدہ دلا سکے گا لیکن دسیم خان منحرف نہ ہوا۔ اپنے اقبالی بیان پر قائم رہا۔

مجھٹریٹ نے کیس سیشن کورٹ کے سپرد کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ دسیم خان وہاں جا کر اقبالی بیان سے منحرف ہو جائے گا اور اس کا وکیل استغاثہ کے کمزور گواہوں پر جرح کر کے کیس بری کر لے گا۔ میرا سب سے زیادہ اہم گواہ سب سے زیادہ ملکر در تھا، یہ وہ بیرا تھا جس نے دسیم خان کو کورسے میں مقتول کی لاش کے پاس کھڑے دیکھا تھا۔ سیشن کورٹ میں صفائی کے وکیل نے اس پر جرح کر کے سیشن جج کے دل میں یہ شک پیدا کر دیا تھا کہ بیرا قابلِ اعتماد گواہ نہیں اور یہ گواہ دراصل موثر گواہ ہے ہی نہیں۔

وکیل نے میرے تمام گواہوں کو کورسے اور کر دیا لیکن دسیم خان کا جب آخر میں بیان ہوا تو اس نے اپنے وکیل کے کیسے کرانے پر پانی پھیر دیا اور ثابت کر دیا کہ تمام گواہوں نے سچ بولا ہے اور یہ قتل اسی نے کیا ہے۔

میری ہمدردی قاتل کے ساتھ

مجھے توقع تھی راور میری دلی خواہش بھی یہی تھی، کہ سیشن جج دسیم خان کی صاف گوئی کا صلہ ضرور دے گا اور اسے سزائے موت نہیں دے گا، مگر اس کی بد قسمتی کہ سیشن جج

گئی۔ مسلمانوں نے پاکستان سے کدو لیا۔ میں بھی پاکستان میں آ گیا۔ سرکاری طور پر مجھے بوٹھا قرار دے کر پنشن دے دی گئی۔ مجھے ہندوستان میں زمین کے بدلے پاکستان میں کافی اراضی مل گئی اور میں کاشت کار بن گیا۔

۱۹۶۲ء کا ذکر ہے کہ میں شہر گیا تو رشید مل گیا۔ میں اسے پہچان نہ سکا۔ میں نے اسے بیس سال کی عمر میں دیکھا تھا جب وہ میری نظر میں پختہ تھا۔ اب اس کی عمر چالیس سال تھی۔ چہرے پر پختہ عمر کے آثار تھے۔ اس نے مجھے پہچان لیا۔ مجھے دسیم خان یاد آ گیا۔ اور بیس سال پرانا کیس میرے ذہن میں کل بات کی بات کی طرح تازہ ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ خدا نے مجھے بڑا اچھا موقع دیا ہے۔ اب اس سے دسیم خان کے متعلق باتیں کروں گا۔

پہلے تو رشید کے پرتھو سہی باتیں ہوتی رہیں۔ معلوم ہوا کہ اس کے پاس تین مربع زمین ہے لیکن تو تبر نہ لٹنے کی وجہ سے خراب ہو رہی ہے۔ اب وہ زمین کی طرٹ ذاتی توجہ دینا چاہتا تھا۔ وہ شہر سے ٹیوب ویل خریدنے آیا تھا۔ میں اسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ وہاں اس نے اپنی اراضی کے متعلق مسائل مجھے بتائے۔ مجھے ذراعت سے اتنا لگاؤ تھا کہ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے کبھی اپنی اراضی پر لے چلے پھر میں اسے بتاؤں گا کہ وہاں کیا کرنا چاہیے اور ٹیوب ویل کی ضرورت ہے یا نہیں۔

ہوٹل میں ہم اراضی اور ذراعت کے متعلق ہی باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم اگلی ملاقات کا پروگرام طے کر کے جدا ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق میں چند دنوں بعد اس کے ہاں گیا۔ وہاں سے اس کی اراضی پر جانا تھا جو وہاں سے اتنی نوٹے میل دور تھی۔ میں اس کے گھر گیا۔ بہت خوبصورت کوٹھی تھی۔ اس کی بیوی ڈرائیونگ روم میں آگئی۔ اسے دیکھا تو میں بڑی طرح ہلکا ہوا۔ میری آنکھیں ٹھہر گئیں۔ وہ رفعت تھی۔ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی لیکن مجھے

بے چینی سی محسوس کی۔ ایک معزز اور شگفتہ مزاج آدمی جیسے ہنسا کھیلتا آیا اور چھانسی کے تھپے پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں پھیندا اپنے گلے میں ڈال لیا۔ میں اسے قبول نہ سکا۔

پارسل بعد میں سی آئی اے میں تھا۔ مسلم لیگ کا تاریخی جلسہ ملی میں ہوا۔ قائد اعظم کی تقریر سنائی۔ سی آئی ڈی کا بیشتر عملہ عام شہری کپڑوں میں جلسے میں ڈیوٹی پر تھا۔ میں بھی اس جلسے میں ڈیوٹی پر ہی شریک ہوا۔ لاہور والے۔ ۱۹۴۰ء کے جلسے کے بعد جس میں قراقرم اور پاکستان منظور کی گئی تھی، اسی کا یہ جلسہ یادگار تھا جس میں مسلمانوں نے انگریزی حکومت اور ہندوؤں کی لاکھوں کو بتا دیا کہ وہ پاکستان سے کچھ بھی قبول نہیں کریں گے۔

اس جلسے میں مجھے رشید نظر آیا، وہ کالج سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے مسلم لیگ کا بیج بکھا رکھا تھا اور بڑے جوش و خروش سے جھاگ دوڑ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا۔ بٹے پتاک سے ملا۔ کہنے لگا۔ ”آپ نے اچھا کیا کہ وردی میں جلسے میں نہیں آئے۔“ میں ہنس پڑا۔ میرے دل میں آئی کہ اس سے پوچھوں کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ میں اس سے دسیم خان کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر وہ بہت مصروف تھا۔ قائد اعظم تشریف لانے والے تھے۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔

اصل قاتل پاکستان میں ملا

اس سے چند ہی دنوں بعد مجھے کرنل آبدار اور ابراہیم کی لاشوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹیں ملے۔ کرنٹیشن پر لگا دیا گیا۔ یہ کیس آپ کو اپنی کتاب ”کار، شلوار، اور دوپٹہ“ میں سنا چکا ہوگا۔ اس کا عثمان تھا وہی سیڑھیاں وہی زہر۔ اس کے بعد چند اور کیس آئے پھر دنیا ہی بدل

ابھی تک اٹھارہ انیس سال کی لڑکی لگتی تھی۔ بیس برسوں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس لڑکی کی خاطر ایک نوجوان لڑکا قتل ہوا اور ایک معزز آدمی بھانسی چڑھ گیا تھا۔

میں اسے اسلام علیکم کہنا بھی بھول گیا۔ اس نے مسکرا کر اسلام علیکم کہی تو میں حیرت سے بیدار ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رشید نے اسے بتایا نہیں تھا کہ میں آ رہا ہوں یا میں وہی انیکڑ ہوں جس نے دسیم خان کو بھانسی چڑھوایا تھا۔ اس نے مجھے پہچانا نہیں۔ رشید نے کہا۔ ”تم نے پہچانا نہیں رفعت؟ انسپکٹر احمد یار خان ہیں یہ۔ دسیم خان کے کس والے۔“

رفعت کے منہ سے آہ کی طرح نکلا۔ ”اُوہ“ اور اس کا اتنا اچھا رنگ پھسکا پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں بے چینی سے حرکت کرنے لگیں۔ اس نے رشید سے کہا۔ ”آپ ٹھہریں۔“ اور وہ اٹھ کر بہت تیز تیز قدم اٹھاتی ڈرائیونگ روم سے نکل گئی۔ رشید بھی پریشان ہو گیا۔ وہ توجیسے میری موجودگی کو ہی بھول گیا تھا۔ وہ بھی اٹھا اور اندر چلا گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد رشید واپس آیا تو میں نے پوچھا کہ کیا ہو گیا تھا؟ رفعت کو کوئی تکلیف ہو گئی ہے؟

”مجھ سے ایک بھول ہو گئی تھی۔“ اس نے گہرائے گہرائے ہلچے میں جواب دیا۔ میں بھول گیا تھا۔ مجھے آپ کو رفعت کے سامنے نہیں لانا چاہیے تھا۔ اس نے آپ کو پہچانا نہیں تھا۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو تعارت کر دیا۔“

”میں سمجھ گیا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ مجھے دسیم خان کا قاتل سمجھتی ہوگی۔“

”نہیں،“ رشید نے کہا۔ ”آپ کے خلاف اسے کوئی شکایت نہیں۔ آپ کو دیکھ کر اسے

دسیم خان یاد آ گیا ہے۔۔۔۔۔ دسیم خان کے بھانسی چڑھنے کے بعد رفعت تقریباً پاگل ہو گئی تھی۔ دسیم خان کی لاش ہم نے ہی دفن کی تھی۔ اس کا اور کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ رفعت نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے ہم کئی بار دسیم خان کی قبر سے اٹھا کر لائے تھے۔ تین چار بار وہ رات کو غائب ہو گئی تھی اور ہر بار دسیم خان کی قبر پر بیٹھی ہوتی ملی۔ ہماری منگنی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ شادی کر دی جائے تاکہ رفعت کی توجہ تقسیم ہو جائے۔۔۔۔

”شادی کر کے بھی رفعت ٹھیک نہ ہوئی۔ شادی ۱۹۴۳ء میں ہو گئی تھی۔ پہلے تو ڈاکٹر علاج کرتے رہے پھر انگریز ماہر نفسیات کا علاج شروع کر دیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ دو چار گھنٹوں کیلئے نارمل ہو جاتی تھی۔ اس دوران ایک بچہ پیدا ہوا مگر رفعت نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ پاکستان بن گیا۔ ہم ستمبر ۱۹۴۷ء میں انڈیا سے روانہ ہوئے۔ وہاں سے آنے میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ والد صاحب مرحوم نے ایک ٹرک کا انتظام کر لیا تھا۔ ہم پاکستان تک خیریت سے آگئے لیکن راستے میں رفعت نے سڑکوں پر اور کھیتوں میں مسلمانوں کی جولاہیں دکھیں انہوں نے اس کے ذہن کو بھجھوڑ دیا۔ ان میں بچوں کی لاشیں بھی تھیں اور عورتوں کی بھی۔ وہ تو آپ نے بھی دیکھی ہوں گی۔ قدم قدم پر لاش تھی اور سڑکیں خون سے لال تھیں۔۔۔۔

”رفعت جب پاکستان میں داخل ہوئی تو وہ نارمل تھی۔ اس نے کہا۔ میں ایک دسیم کو روٹی تھی یہاں تو میرے لاکھوں دسیم قتل ہو گئے ہیں۔ یہ ایسا صدمہ تھا جس نے اسے نارمل کر دیا۔ پھر وہ ٹھیک رہی۔ اگر کسی نے گھر میں دسیم خان کا نام لے لیا تو رفعت کی یہی حالت ہو جاتی تھی جو آج ہوئی ہے۔ ہم سب محتاط ہو گئے۔ پھر والد صاحب بھی فوت ہو گئے اور اتنی جان بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ رفعت کے والدین بھی فوت ہو چکے ہیں۔ اب ہم ہیں اور ہمارے بچے ہیں۔ ایک مدت گزر گئی ہے کہ گھر میں دسیم خان کا نام کسی نے نہیں لیا تھا۔ آج آپ کو دیکھ کر رفعت

میں میں ان کے ہاں تین تین دن بھی رہا۔ رفعت میرے ساتھ بے تکلف ہو گئی۔ اس نے مجھے ذہنی طور پر یہاں تک قبول کر لیا کہ اس کا وہ رد عمل نہ ہوا جو مجھے پہلے روز دیکھ کر ہوا تھا۔ پھر اس میں یہ تبدیلی بھی آئی کہ میرے پاس بیٹھ کر دوسم خان کی باتیں کرنے لگی۔ میں نے کڑکڑ کر کہا کہ اس سے سناری باتیں سن میں۔ رشید نے بھی مجھے سناری بات سنا دی اور اس طرح جو کہانی میرے سامنے آئی وہ مزید ایشیاری کی ایک غیر معمولی مثال ہے۔ میں یہ کہانی اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

رفعت امیر گھرانے کی رشکی ہے۔ اس کا خاندان ہندوستان کے اسی شہر کا رہنے والا تھا جہاں قتل کی واردات ہوئی تھی۔ رشید بھی امیر کے گھرانے کا فرد ہے۔ وہ اس شہر سے کچھ دور ایک قصبے کا رہنے والا تھا۔ اس شہر میں کالج میں پڑھتا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ رفعت دیکھ کر کالج میں پڑھتی تھی۔ رفعت سینڈھائی میں تھی، رشید ٹھڈائی میں۔ کسی طرح ان کا تعارف ہو گیا۔ پھر دونوں کی ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ دونوں آزاد خیال امیر گھرانے کے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ کچھ بندوں ملتے رہے۔ رفعت ہوسٹل میں اس کے کمرے میں بھی جاتی رہی۔ دونوں جذبہ جاتی تھے۔ عمر ہی ایسی تھی۔ رفعت نے اپنی ماں سے رشید کا ذکر کیا۔ ماں نے اسے کہا کہ وہ رشید کو گھر لائے۔ رشید ان کے گھر گیا تو رفعت کی ماں کو وہ اچھا لگا۔ پھر اس کا تعارف رفعت کے والد صاحب سے ہوا۔ اس کے بعد رشید رفعت کے گھر آنے جانے لگا۔

چھٹیوں میں رشید اپنے گھر گیا تو رفعت اور اس کے خاندان کا ذکر اپنے والدین سے کیا۔ اس کے والد صاحب شہر میں آئے تو رشید انہیں رفعت کے گھر لے گیا۔ دونوں کے والد صاحبان ایک دوسرے میں گھل گئے۔ پھر ان کی ملاقاتیں شروع ہو گئیں اور رشید اور رفعت کی منگنی ہو گئی۔ دونوں کالج میں پڑھتے رہے۔

ایک روز رفعت رشید کے ہوسٹل میں گئی اور اسے کہا کہ دریا کے کنارے چلتے ہیں۔

کو دوسم خان یاد آ گیا ہے۔۔۔۔۔ سنبھل جائے گی۔ میں اسے ایک گولی کھلا آیا ہوں۔
”ہاں رشید صاحب۔“ میں نے بڑے دکھ سے کہا۔ رفعت کو اتنا ہی جذباتی ہونا چاہیے تھا۔

دوسم خان اسی کی عزت کی خاطر پھانسی چڑھا تھا۔
”نہیں۔“ رشید نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ جانے کیا سوچنے لگا۔ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ ”رفعت کی اس ذہنی کیفیت کی وجہ کچھ اور ہے۔“ جب رشید نے وجہ بتائی تو مجھے اس طرح دھکا لگا جیسے میرے قریب بم پھٹا ہو۔ اس نے کہا۔ ”دوسم خان بے گناہ پھانسی چڑھا گیا تھا۔“

”بے گناہ؟“ میں نے صوفے سے اچھل کر پوچھا۔ ”کیا اس نے اس رٹکے کو قتل نہیں کیا تھا؟“

”نہیں۔“ رشید نے کہا۔ ”اس رٹکے کو میں نے قتل کیا تھا۔ دوسم خان نے میرے گلے سے پھندا اتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا تھا۔۔۔۔۔ کسی وقت آپ کو پوری کہانی سناؤں گا۔“

رازِ سیس برس بعد کھلا

میں وہ رات ان کے ہاں ٹھہرا۔ دوسرے روز رشید مجھے اپنی کار میں اپنی اراضی پر لے گیا۔ میں نے اراضی کی حالت دیکھ کر اسے کئی ایک مشورے دیئے۔ کچھ کام وہیں کے مزارعوں سے شروع کرادیئے۔ اس کے بعد میں اپنے چک میں آ گیا۔ اپنے دو تجربہ کار اور ذہین مزارعے رشید کو دے دیئے۔ کئی بار تہر گیا۔ رشید سے ملا۔ اسے ساتھ لیا اور اس کی اراضی پر گئے۔

تین مہینے صرف کر کے میں نے رشید کے تقریباً تمام زرعی مسائل حل کر دیئے۔ ان تین مہینوں

کی برکھیں قدر سے مخرج ہو گئیں۔ اس نے سر جھکا لیا اور وہ ٹھلٹے ٹھلٹے اوٹ سے نکل کر پھوڑا
میں جا کھڑا ہوا۔ میں نے رفعت سے آہستہ سے کہا، 'شاعر معلوم ہوتا ہے، لیکن وہ اسے دلچسپی
سے دیکھ رہی تھی۔'

دسیم خان پھوڑا میں چلا گیا تھا۔ رشید اور رفعت کی طرف اس کی بیٹھ تھی۔ وہ اچانک
پچھلے کھوکھوڑا۔ اب وہ پہلے کی طرح مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ 'یہ پھوڑا بہت اچھی لگتی ہے۔ دیکھو
بچو۔ اس پھوڑا سے چھپو نہیں۔ گھومو پھوڑو۔' پھر اس نے رشید سے کہا۔ 'گرمیری پہلی
بیٹی زندہ ہوتی تو رفعت کی طرح ہوتی۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی بچی یاد آگئی تھی۔'

رشید نے اس کے متعلق اپنی رائے بدل لی۔ وہ اسے جواں سال آدمی سمجھتا تھا مگر وہ چالیس
سال سے کچھ زیادہ ہی عمر کا تھا۔ اس کی شکستگی عود کر آئی اور اس نے کچھ ایسی پیاری باتیں کہیں کہ
رفعت اور رشید اس سے بہت متاثر ہوئے۔ رفعت کے کہنے کے مطابق، اس نے جو تاثر قبول
کیا وہ غیر معمولی تھا اور اس کا تعلق براہ راست جذبات سے تھا۔ ان دونوں کی فرمائش پر
دسیم خان نے انہیں دو گیت اور ایک غزل سنائی۔ اس شام وہ بہت دیر تک دیسم خان کیساتھ
رہے۔ وہ ان کے ساتھ بچوں کی طرح ہنسا گھمٹا رہا۔ پھر وہ اکٹھے واپس گئے۔

دو دین روز بعد رشید اور رفعت اس کے گھر گئے۔ دیسم خان نے ان کا اپنی بیوی سے
تعارف کرایا۔ دیسم خان کی بیوی ساڑھے سے رنگ کی عورت تھی جس کے نقش و نگار میں بڑی
کشش تھی۔ معلوم ہوا کہ دیسم خان کے تین بچے پیدا ہوئے تھے۔ تینوں باری باری بچپن میں
ہی مر گئے۔ دیسم خان کی بیوی کو بچوں کا بہت غم تھا۔ انہیں یاد کر کے روتی تھی یہی غم دیسم خان
کے دل کو بھی جلا رہا تھا لیکن اس نے غم کو مسکراہٹوں، تہمتوں اور لطیفوں میں چھپا لیا تھا۔ البتہ
وہ جب کا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آواز غم اور سوز میں ڈوبی ہوئی ہے۔

رشید اسے دریا پہ لے گیا۔ تھوڑی دیر کشتی کی سیر کی پھر دریا کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے ذرا دور نکل
گئے اور پھوڑا پر ٹہنے لگی۔ وہ درختوں کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ قریب ہی کہیں سے انہیں
کسی کے گلنے کی دھیمی دھیمی اور بڑی ہی سرلی آواز سنائی دی۔ وہ سمجھے کہ کوئی ملاح یا ماہی گیر
ہوگا۔ وہ اس طرف چلے گئے۔ وہاں قدرتی بیوں نے دو تین درختوں پر چڑھ کر ایک کرو سا بنا
رکھا تھا۔ وہاں ایک خوش وضع اور خوش پوش آدمی کھڑا رہا تھا۔ رشید اور رفعت جمبذپ
گئے اور کانے والا چپ ہو کر مسکرایا۔ اس نے کہا۔ 'یہیں آجائیں۔ میں بھی پھوڑا سے چھپا
کھڑا ہوں۔۔۔۔۔ آپ دونوں سٹوڈنٹ ہیں؟'

رفعت نے اپنا اور رشید کا تعارف کرایا۔ اور اس آدمی نے اپنا نام دیسم خان بتایا۔
رفعت کہتی ہے کہ جب دیسم خان اور اس کی آنکھیں آمنے سامنے ملیں تو دیسم خان کی
مسکراہٹ بیکھت غائب ہو گئی اور اس کا چہرہ اس طرح ادا سا ہو گیا جیسے چاند پر بادل آ گیا
ہو۔ یہ تبدیلی اتنی نمایاں تھی کہ رفعت پریشان سی ہو گئی۔ دیسم خان نے اس سے پوچھا۔
'آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟'

رفعت نے اسے بتایا کہ دیسم خان گہری سوچ میں کھو گیا۔ رشید نے یہ کہانی سناتے ہوئے
اپنے اُس وقت کے تاثرات ان الفاظ میں بیان کیے۔ 'دیسم خان رفعت کو دیکھتے ہی سنجیدہ
ہو گیا اور میں سمجھا کہ یہ رفعت کی خوبصورتی کا اثر ہے۔ اسے جو کوئی دیکھتا ہے کچھ دیر دیکھتا ہی
رہتا ہے۔ دیسم خان کے متعلق بھی میں نے ایسی ہی رائے قائم کی۔ اسے تو جیسے یہ خیال ہی نہیں
رہا تھا کہ میں بھی وہاں موجود ہوں۔ وہ صرف رفعت سے اس کے خاندان اور حسب نسب کے
متعلق پوچھتا رہا۔

رفعت نے جب اپنے والد صاحب کا نام بتایا تو دیسم خان کے منہ سے آہستہ ہی نکل گئی۔ اس

وہ بھی اس طرح جیسے دودھ پیتا بچہ سموک سے رو رہا ہو۔

رفعت جذباتی طور پر دوسم خان کی غلام ہو گئی تھی۔ وہ اب پہلے سے زیادہ اس کے گھر جہانے لگی۔ شام کو جاتی تھی۔ دوسم خان کھانا پکانے کے لیے خانہ ماں رکھ لیا تھا۔ رفعت کبھی کبھی اسے اپنے ہاتھ سے پلا کر کھلاتی۔ اس کے دل میں رشید کی جو محبت تھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ دوسم خان کے ساتھ بھی اسے محبت ہی تھی لیکن اس کا رنگ کچھ اور تھا جسے رفعت نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا۔ ”وہ میرا پر اور مرشد تھا، میرا بھائی تھا، میرا بیٹا تھا اور میرا ہزار دوست تھا۔۔۔ رفعت نے یہ بات سناتے ہوئے رشید کے سامنے بے باکی سے کہا۔ اور اگر وہ مجھے یہ کہہ بیٹھا کہ رفعت، میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو میں کبھی انکار نہ کرتی۔“

ایک بھید ایک غلط فہمی

دوسم خان نے بیوی کے صدمے کو برداشت کرنے کی بہت کوشش کی۔ پہلے سے زیادہ ہنسنے اور گنگانے لگا کر رفعت کے سامنے کئی بار رو پڑا۔ اس نے رفعت کو بتایا کہ وہ بعض راتیں سو نہیں سکتا اور دریا کے کنارے ٹھلنے نکل جاتا ہے۔ ایک بار رفعت نے اسے کہہ ہی دیا۔ ”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں باجی کی جگہ لے سکتی ہوں تو میں حاضر ہوں۔“

دوسم خان نے اسے اپنے سینے سے لگایا اور کہا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے دلی مسرت اس روز ہوگی جس روز رشید تمہیں ڈولی میں بٹھا کر لے جائے گا۔ تمہارا ادھا جہیز تو میرے ذمے ہے۔ جب تمہاری شادی کا دن مقرر ہو جائے گا تو تم سے اور رشید سے پوچھوں گا کہ تمہارے لیے کیا کچھ بناؤں۔ میرا اب دنیا میں کون ہے۔“

اس روز کے بعد رفعت کا یہ معمول بن گیا کہ تیسرے چوتھے روز دوسم خان کے گھر چلی جاتی۔ وہ یہ غیبی کرتی رہی کہ دوسم خان کی بیوی کے پاس بیٹھنے کی بجائے زیادہ دیر دوسم خان کے پاس بیٹھی رہتی۔ رفعت نے مجھے بتایا کہ دوسم خان اسے دیکھتا تھا تو اس پر کوئی ایسی ذہنی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جسے وہ آج بھی بیان نہیں کر سکتی۔ ان میں ہزار دوستوں والی بے تکلفی بھی پیدا ہو گئی اور رفعت عمر کا فرق بھول گئی۔ وہ دوسم خان کے پاس بیٹھ کر روحانی سکون محسوس کرتی تھی۔

کبھی کبھی رشید بھی دوسم خان کے گھر جاتا تھا۔ ایک مہینے بعد کچھ ناگواریاں پیدا ہونے لگیں۔ رشید رفعت اور دوسم خان کی بے تکلفی کو ناپسند کرنے لگا۔ وہ آخر اس کی منگیتر تھی۔ دوسم خان کی بیوی بھی شکوک میں مبتلا ہو گئی۔ یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ دوسم خان اور اس کی بیوی کی آپس میں اس بات پر کبھی لڑائی ہوئی تھی یا نہیں، البتہ رشید اور رفعت کی آپس میں جھجک جھجک ہونے لگی۔ رفعت نے دوسم خان کو بتا دیا کہ رشید اس سے بدظن ہوتا جا رہا ہے۔ دوسم خان نے رشید کو سمجھایا کہ اس کی عمر بیالیس سال ہے اور رفعت کی عمر بھی بیس سال بھی نہیں ہوئی۔ یہ تو باپ بیٹی کا رشتہ ہے۔ رشید نے اسے صاف لفظوں میں کہا کہ بیشک وہ بیالیس سال کا ہے لیکن اس میں اتنی شکستگی اور اتنی زلفگی ہے کہ رفعت عمر کو نظر انداز کر چکی ہے۔ دوسم خان نے اس کا شک رفع کرنے کی بہت کوشش کی لیکن رشید بدظن رہا اور بدظن ہی رہتا چلا گیا۔

ایک مہینہ اور گزر گیا۔ ایک روز دوسم خان کے گھر گئے تو معلوم ہوا کہ اس کی بیوی مر گئی ہے۔ اسے دل کے مقام پر درد اٹھا۔ ڈاکٹر فرما گیا لیکن مر لے نہیں دے سکی۔ یہ دل کے مرض کا حملہ تھا جو اچانک ہوا۔ رشید اور رفعت نے دوسم خان کو پہلی بار روئے دیکھا اور

میں نے رشید سے پوچھا کیا آپ نے اس کی انگ پٹائی کی تھی؟ دوسرے بھی تو رفعت کی حفاظت کے لیے اس کے کالج کے سامنے چلے جایا کرتے تھے۔

”یہ غلط ہے“ رشید نے کہا۔ ”دیسم خان کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ کوئی لڑکا رفعت کو پریشان کرتا ہے۔ کالجوں میں ایسے تو ہوتا ہی رہتا تھا۔ دیسم خان نے اپنے اتبائی بیان میں جھوٹ بولا تھا کہ اس نے اس لڑکے کی پٹائی کی تھی۔ اس نے لڑکے کو کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔“

ایک روز مقتول نے رشید کو دمکی دی کہ وہ اسے قتل کرادے گا اور رفعت کو اغوا کرالے گا۔ رشید نے اُس روز بہت سوچا کہ وہ کیا کرے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ لڑکے کو شام کو ہوٹل میں لے اور اسے دوستانہ طریقے سے سمجھائے اور اگر وہ نہیں سمجھتا تو پھر سوچا جائے گا کہ کون کسے قتل کرانا ہے۔ یہ سوچ کر رشید شام سوا آٹھ بجے ہوٹل میں گیا۔ اس نے وہاں اپنے کالج کے دور لڑکے کھانا کھانے دیکھے۔ اس نے ان سے چھپنے کی کوشش نہ کی کیونکہ وہ قتل کی نیت سے نہیں گیا تھا۔

وہ مقتول کے کمرے میں گیا اور دوستانہ انداز میں بات شروع کی۔ مقتول نے اسے شاید رشید کی بزدلی سمجھا۔ اس نے طنز یہ باتیں کیں۔ ترش کلامی شروع ہوگئی۔ رشید جھڑک اٹھا۔ مقتول نے میز کا دراز کھولا اور اس میں سے چاقو نکال لیا۔ وہ چاقو کھول رہا تھا کہ رشید نے اسے باگردوں کی طرح سیدھا گھونسل پوری طاقت سے مارا جو مقتول کو کان کے نیچے گردن پر لگا۔ مقتول کے پاؤں اٹھ گئے اور وہ تین چار قدم پر سے جاگرا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

رشید نے نہایت پھرتی سے چاقو اٹھایا۔ مقتول بہت تیزی سے اٹھا اور جھک کر رشید کی طرف دوڑا۔ رشید چاقو اٹھا کر ابھی سیدھا نہیں ہوا تھا رشید نے نیچے سے چاقو کا دار کیا۔ اس کا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا۔ اگر مقتول نے کوٹ اور سویڑھ بہنا ہوتا تو چاقو بڑی شکل سے کھال تک پہنچ سکتا۔ اس نے کرتہ پہن رکھا تھا۔ چاقو کی نوک کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اُدھر

رفعت نے یہ ساری باتیں رشید کو بتائیں لیکن رشید کا دل صاف نہ ہو سکا۔ رشید بزدل تھا اور زور درنج تھا۔ اس نے ایک روز رفعت سے یہاں تک کہہ دیا۔ ”تم مجھے دھوکے میں نہ رکھو رفعت۔ تمہیں اب دیسم خان اور مجھ میں سے انتخاب کرنا ہوگا۔“

رفعت اس شام دیسم خان کے گھر گئی اور اسے یہ بات بتائی۔ دیسم خان نے رفعت کو گھر بھیج دیا اور خود رشید کے ہوٹل میں گیا۔ رشید کے دل میں دیسم خان کے خلاف غصہ بھرا ہوا تھا لیکن دیسم خان سامنے آیا تو رشید کے آسودہ نکل آئے۔ اس کا ذہن پختہ نہیں تھا۔ دیسم خان کو وہ اپنا دشمن بھی سمجھتا تھا اور دوست بھی۔ دیسم خان نے اسے پیار سے سمجھایا پھر غصے میں بھی سمجھایا۔

رشید نے اسے کہا۔ ”آپ ہمارے درمیان سے ہٹ جائیں۔ رفعت کے متعلق آپ کا دل پاک ہو سکتا ہے لیکن رفعت جب آپ کی باتیں کرتی ہے تو مجھے اس کا دل صاف نظر نہیں آتا۔“

دیسم خان نے اسے جواب دیا۔ ”ہاں۔“ انہیں کد لگا کہ تمہارے اور رفعت کے درمیان سے ہٹ جاؤں۔“

انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ مقتول رفعت کے پیچھے بڑ گیا۔ چھٹی کے وقت وہ رفعت کے کالج کے باہر جا کھڑا ہوا اور دو رنگ رفعت کا پیچھا کرتا۔ پھر اسے تھکے دکھانے لگا۔ کبھی گلدستے کے اس کے پیچھے چل پڑتا۔ رفعت نے رشید کو بتایا۔ رشید اس کا کلاس فیلو تھا۔ اس نے مقتول کو بتایا کہ رفعت اس کی منگیتر ہے، اسے پریشان نہ کیا کرے لیکن لڑکا ڈھیٹ تھا اور وہ بھی امیر کبیر ماں باپ کا بیٹا تھا۔ اسی لیے ہوٹل میں رہتا تھا۔ رشید نے رفعت کی حفاظت شروع کر دی۔ وہ لڑکا پھر بھی دلیری سے رفعت کو پریشان کرتا رہا۔ دو تین بار ہاتھ پائی اور مار کٹائی تک نوبت آگئی۔

تھا، خون کے قطرے لگے ہوئے تھے۔

دیسم خان نے اسے تانگے میں بیٹھایا اور اسے تسی دلاسا دیتا ہوا اسے اس کے ہوسٹل کے کمرے میں لے گیا۔ اس کا سوٹ اور قمیض اترا کر اسے کہا کہ وہ سیلینگ سوٹ پہن لے۔ اس کا کوٹ، پتلون اور قمیض دیسم نے ایک میز پر پش میں لپیٹ لیے۔ پھر اس سے کہا کہ وہ ہوسٹل میں داخل ہونے کے وقت سے لے کر ہوسٹل سے بھاگنے تک کی ایک ایک تفصیل بتائے اور یہ بھی بتائے کہ اسے کسی جان پہچان والے نے وہاں دیکھا تھا یا نہیں۔

رشید نے اسے تمام تفصیلات بتادیں۔ یہ وہی تفصیلات تھیں جو دیسم خان نے اقبال جرم میں بیان کی تھیں اور دوسرے گواہوں نے تصدیق کی تھی۔ دیسم خان نے پولیس والوں کی طرح سوال کر کے کچھ اور باتیں بھی اس سے معلوم کر لیں۔ وہ تجربہ کار اور جہاں دیدہ آدمی تھا۔ اس نے رشید کو یقین دلایا کہ ہو سکتا ہے اسے گرفتار کر لیا جائے لیکن اسے سزا نہیں مل سکتی۔ اس نے رشید کو اس طرح کی ہدایات دیں۔ اگر کراچ کے ان دو لوگوں نے جو ہوسٹل میں کھانا کھا رہے تھے پولیس کو بتا دیا کہ رشید ہوسٹل کی بلانی منزل میں گیا تھا تو ہو سکتا ہے پولیس تمہیں رات کو یا صبح بھانے لے جائے۔ وہ بے خطر ناک گواہ ہے جس نے تمہیں چاقو مارا تھا میں کپڑے مقتول کی لاش کے کمرے میں کھڑے دیکھا تھا۔ میں جا کر دیکھتا ہوں کہ پولیس کیا کر رہی ہے۔ پولیس اپنی کارروائی میں بہت وقت لگائے گی۔ اگر تمہیں بھانے لے جایا گیا تو میں بھانے میں پہنچ جاؤں گا۔ تم جرم سے انکار کرتے رہنا۔ میں بھانے میں آکر کہوں گا کہ اڑے کے کو میں نے قتل کیا ہے۔ تم بالکل خاموش رہنا اور یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں پولیس کو دھوکے میں ڈال دوں گا۔ تمہارے بچنے کی یہی ایک صورت ہے۔ تمہیں الزام سے خارج کر کے میں اپنا بچاؤ خود کروں گا۔“

سے مقتول جھکا ہوا اتنی تیزی سے آیا کہ رکنے کی بجائے بے قابو ہو کر آگے کو ہی آگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر رشید کا وارادہ اُدھر سے مقتول جھکا ہوا تیز رفتار آیا۔ چاقو، اتفاق سے دل پر لگا اور دل میں اُتر گیا۔

مقتول نے بیخ ماری اور اس کے منہ سے بڑھی زور سے ہائے۔ وہ ہانکی۔ رشید نے چہرہ کھینچ لیا۔ مقتول پیٹ کے بل گر پڑا۔ ساتھ ہی دروازہ کھلا اور ایک بے راہ تھیں میں ٹرے اٹھائے اندر آگیا۔ سب کچھ دو تین سیکنڈ میں ہو گیا۔ رشید نے چاقو پھینکا اور بیرے کو دھکا دے کر باہر کو دوڑ پڑا۔ بیرے نے شور مچا دیا۔ قتل ہو گیا۔ لڑکا مارا گیا۔“

رشید کھانے کے ہال والی سیڑھیوں سے اترنے کی بجائے پھوپڑ سے کی سیڑھیوں کی طرف گیا۔ وہ بہت تیزی سے اُترا اور آخری سیڑھی سے گر پڑا۔ اُدھر سے ایک آدمی شور مچ کر اس کی طرف دوڑا۔ اس نے بلی کپڑو، کپڑو، کاشور مچایا۔ رشید اٹھ کر دوڑ پڑا۔ کچھ دیر تک وہ اندھیری گلیوں میں چلتا اور سوچتا رہا کہ کہاں جائے۔ رفعت کے گھر کا خیال آیا تو اس نے سوچا کہ اس کے والد صاحب بگڑتے جا میں کرم قاتل ہو۔ وہ اس قدر خوفزدہ تھا کہ اسے اپنے قریب سے گزرتے ہوئے انسانوں سے ڈرانے لگا۔ ایک جگہ اسے ایک پولیس کانسٹیبل نظر آیا تو اس نے وہ راستہ ہی چھوڑ دیا۔ وہ اب پناہیں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے کانوں میں ایسی آوازیں گونجنے لگیں جیسے بہت سے لوگ اس کے تعاقب میں دوڑے آ رہے ہوں۔ اس سے وہ اور زیادہ گھبرا گیا۔ سڑک پر جا کر وہ تانگے میں بیٹھا اور دیسم خان کے گھر چلا گیا۔

اس نے دیسم خان کو سارا واقعہ اور مقتول کی رفعت کے ساتھ چھڑ چھاڑ وغیرہ سنا دی۔ دیسم خان نے اس کی پتلون دیکھی۔ گھٹنوں پر گرگڑ کے نشان تھے۔ اس کے کوٹ، پتلون اور قمیض کو اچھی طرح دیکھا۔ کوٹ کی دائیں آستین اور قمیض کی آستین کے کٹ پر جو کوٹ سے ڈنبا،

اتنی قربانی؟ ایسا ایثار؟

اُس وقت رشید کی جذباتی حالت ایسی تھی کہ ویم خان اسے جو کچھ کہتا رہا وہ تسلیم کرتا رہا۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ ویم خان نے اس کے کپڑے جو اُس نے میز پوش میں پیٹے تھے، اٹھائے اور جب وہ چلنے لگا تو رشید ڈرے ہوئے بچے کی طرح اس کے ساتھ لپٹ گیا اور رو پڑا۔ کہنے لگا۔ ”آپ رز جا میں۔ یہیں رہیں یا مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔“

ویم خان نے اسے سمجھایا کہ اس کا اب کمرے سے غیر حاضر ہونا مناسب نہیں۔ وہ جو صلہ مضبوط رکھے اور اگر پولیس اچھائے تو پوری دیری سے واردات سے لاحلی کا اظہار کرے۔ ویم خان اس کے واردات کے وقت کے کپڑے لے کر چلا گیا۔ پھر ویم خان کہاں کہاں گیا رشید کو کچھ بھی معلوم نہیں۔

ویم خان کے جانے کے تین ساڑھے تین گھنٹوں بعد میں رشید کے کمرے میں گیا میر سے ساتھ اس کے ہوشل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ یہ چند گھنٹے رشید کے لیے قیامت کی گھڑیاں تھیں۔ اگر ویم خان اسے ہدایات نہ دے گیا ہوتا تو رشید بھاگ جاتا اور جب مفروضہ کی حیثیت سے کپڑا جاتا تو یہ کہانی جو مجھے ۱۹۶۲ء میں سنائی گئی ۱۹۶۲ء میں پھانسی کے تختے پر بھی ختم ہو جاتی۔ میری رائے یہ ہے کہ اگر ویم خان اپنے آپ کو پیش نہ کر دیتا تو رشید کو یقیناً سزائے موت ہو جاتی یا سیشن جج اس کی کم عمری پر رحم کرتے ہوئے عمر قید کی سزا دیتا لیکن اُس انگریز سیشن جج سے رحم کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

رشید نے ویم خان کو بتانے میں دیکھا جب میں رشید کو اقبال جرم کے عین گزارے پر

لے آیا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آپ کو سنا چکا ہوں۔ رشید کو میں نے خارج از تفتیش کر دیا تو وہ رفعت کے گھر گیا اور اسے ساری واردات سنا دی رفعت کے والد صاحب بھی جاگ اُٹھے۔ رشید نے انہیں بھی بتایا کہ اس کا ایک کلاس فیلو اس جے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے اور ویم خان نے ڈرامہ کھیلا ہے۔ رفعت کے والد صاحب پریشان ہو گئے۔ وہ ویم خان کو نہیں جانتے تھے۔ رشید اور رفعت نے انہیں بتایا کہ وہ کون ہے اور ان کے ساتھ ان کا کیا تعلق ہے۔

والد صاحب بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ویم خان خلوص اور ایثار کا پیکر ہے ورنہ کسی کی خاطر کون اتنا خطرہ مول لیتا ہے۔ وہ اسی وقت پولیس سٹیشن گئے۔ جگہ میں تھا۔ میں ایس۔ ایچ۔ اوتھا۔ میں نے انہیں ویم خان سے ملنے کی اجازت نہیں دی کیوں کہ مجھے ابھی ویم خان کا اقبالی بیان مجھڑیٹ کے سامنے لے جا کر قلمبند کرانا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ چار پانچ دنوں تک ویم خان کو جیل کی حوالات میں بھیج دیا جائے گا۔ وہاں آپ اسے آسانی سے مل سکتے ہیں۔

میں نے چھٹے روز اپنی کارروائی مکمل کر لی۔ ویم خان کا اقبال جرم قلمبند ہوا اور اسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ رفعت کے والد صاحب راسخ وا سے تھے۔ انہوں نے ویم خان سے ملاقات کی۔ وہ ایک دیکل بھی ساتھ لے گئے تھے۔ رفعت اور رشید بھی ساتھ گئے۔ یہ رفعت کے والد صاحب اور ویم خان کی پہلی ملاقات تھی۔

رفعت نے مجھے سنا یا۔ ہم جیل کے اندر گئے اور ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ویم خان کمرے میں داخل ہوا۔ میں اور رشید اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے آبا جان سے کہا کہ یہ ہیں ویم خان۔ آبا جان نے ویم خان کو دیکھا تو ان کا منہ اور آنکھیں

رفت نے مجھے سنایا۔ ہم گھر گئے۔ آبا جان نے مجھ سے پوچھا کہ دسیم خان سے میری ملاقات کس طرح ہوئی تھی۔ میں انہیں پہلے ہی بتا چکی تھی۔ ایک بار پھر بتا دیا۔ انہوں نے پوچھا۔ دسیم نے تم سے میرے متعلق پوچھا تھا؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے دسیم خان کو آپ کا نام بھی بتایا تھا اور اسی مرحوم کا بھی۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا تھا کہ ہم کہاں کے رہنے والے ہیں۔ آبا جان نے پوچھا۔ دسیم خان نے میرے متعلق کرنی بات کی تھی کبھی؟ میں نے جواب دیا۔ نہیں آبا جان..... آپ ایسی باتیں مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟ میں نے ان سے پوچھا۔ معلوم ہوتا ہے آپ دسیم خان کو پہلے سے جانتے ہیں؟۔۔۔

آبا جان نے کہا کہ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ آدمی ایک غیر معمولی شخصیت ہے۔ میں آبا جان کے اس جواب سے مطمئن نہ ہوئی۔ ان کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ دسیم خان کو پہلے سے جانتے ہیں۔ دسیم خان نے جیل میں انہیں دیکھتے ہی کہا تھا کہ پچھڑے ہوئے مسافر کسی منزل کسی موڑ پر مل ہی جاتے ہیں میں حیران اس پر تھی کہ ایسی کوئی بات ضرور تھی جو آبا جان نے چھپائی تھی لیکن ان دنوں دسیم خان قید میں تھے، اس لیے ہم سب کی توجہ اور غماص طبع پر میرا دھیان ان کی طرف ہی رہتا تھا۔ رات کو جب سونے کے لیے لیٹتی تھی تو دل میں آتی تھی کہ فرش پر سوؤں کیونکہ دسیم خان کا خیال آجاتا تھا کہ وہ فرش پر لیٹے ہوئے ہوں گے۔ رشید اور رفعت نے بتایا (جو میں نے بھی دیکھا تھا) کہ دسیم خان آخر دم تک یہی کہتا رہا کہ وہ آخر میں بیان دے کر سب کو حیران کر دے گا۔ وکیل آخر دم تک مطمئن تھا مگر دسیم نے آخر میں ایسا بیان دیا کہ فی الواقع ہم سب کو حیران کر دیا۔ اپیل بھی نامنظور ہو گئی۔ آٹھویں روز دسیم خان کو پھانسی چڑھنا تھا۔ رشید، رفعت اور اس کے والد صاحب دسیم خان سے ملنے

بورت سے کھل گئیں۔ دسیم خان مسکرا رہے تھے۔ آبا جان کے منہ سے جیسے سسکی نکلی ہو۔ انہوں نے کہا۔ دسیم، تم؟۔۔۔۔۔

”دسیم خان نے مسکرا کر جواب دیا۔ زندگی کا سفر عجیب ہے۔ پچھڑے ہوئے مسافر کسی نہ کسی منزل، کسی نہ کسی موڑ پر مل ہی جاتے ہیں۔ دسیم خان ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے اور ان کی یہی باتیں مجھے بہت پسند تھیں۔ دسیم خان نے آبا جان کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن آبا جان نے ہاتھ ملانے کی بجائے دسیم خان کو بازوؤں میں لے لیا اور کتنی ہی دیر دونوں ایک دوسرے کے سینے سے لگے رہے۔ بہت مختصر باتیں ہوئیں۔ میں سوچتی رہی، کیا آبا جان اور دسیم خان ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟۔۔۔۔۔

ان کے درمیان کسی کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ وکیل نے انہیں بتایا کہ وہ سب سیشن کورٹ میں جائیں تو قبالی بیان سے منحرف ہو جائیں اور بیان دیں کہ پولیس نے تشدد سے بیان لیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ دسیم خان وکیل اور آبا جان کی باتوں کو پورے دھیان سے سن ہی نہیں رہے تھے۔ انہوں نے ہم سب کو یہ کہہ کر بے فکر رہنے کو کہا کہ میں نے رشید کو بچانے کے لیے پولیس کو گمراہ کیا ہے۔ پولیس خوش ہے کہ میں نے اقبال جرم کے شہادت اور ثبوت بھی مہیا کیے ہیں لیکن میں آخر میں جو بیان دوں گا، وہ آپ سب کو حیران کر دے گا۔ میں برسی ہو جاؤں گا۔ وکیل نے انہیں کہا۔ دسیم صاحب آپ نے ان بچوں کی خاطر ایشیا کیا ہے لیکن یہ خیال رکھیے گا کہ قانون آگ ہوتی ہے۔ اس سے کھیلنا بڑا خطرناک ہے عدالت میں میری ہدایات کو نظر انداز نہ کیجئے گا۔ مجھے سیشن کورٹ کا خطہ نظر آ رہا ہے۔“

دسیم خان غمناک تھا جیسے قتل کا جرم اپنے سر سے کو قید ہو جانا کوئی بات ہی نہیں۔ اس نے سب کو یقین دلایا کہ اس نے جو ڈرامہ کھیلا ہے، اس کا انجام اچھا ہوگا۔

گئے تو والد صاحب نے پوچھا — "دیسم، یہ تو نے کیا کیا؟"

دیسم خان نے سلاخوں میں سے مسکرا کر کہا — "جو سوچا تھا وہ کر دیا" — رشید کہتا ہے کہ وہ دیسم خان کی مسکراہٹ پہلے سے زیادہ شوخ اور مسرت سے بھر پور تھی۔ وہ خوش تھا اور بہت ہی خوش — رفعت اور رشید کی رورور بھکی بندھ گئی۔ رفعت کے آبا جاجان بھی روتے رہے اور دیسم خان سب کو ہنس ہنس کر تسلیاں دیتا رہا۔ اس کے بعد سب ہر روز دیسم خان سے ملنے جاتے رہے۔ ایک روز دیسم خان نے رشید سے آہستہ سے کہا — "ایک دن تم اور رفعت آنا۔ آبا جاجان کو ساتھ نہ لانا۔"

موت ایک دن پہلے

ایک روز صرف رشید اور رفعت اُسے ملنے گئے۔ پھانسی میں صرف اگلادن باقی تھا۔ دیسم خان نے رشید سے کہا — "تم مجھے اپنا رقیب سمجھتے رہے ہو رشید۔۔۔ آج تمہارے دل سے سارے شکوک رنج کر دوں گا۔ تم نے ایک روز مجھے کہا تھا کہ میرے اور رفعت کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔ میں تمہارے سامنے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ رہا ہوں۔"

یہ سن کر رشید کی دھاڑیں نکل گئیں۔ دیسم خان نے سلاخوں میں سے ہاتھ باہر نکال کر رشید کے سر اور منہ پر پھیرا اور کہا — "میں تم پر طنز نہیں کر رہا رشید۔ میں نے آج تمہیں ایک کہانی سنانے کے لیے بلایا تھا۔ یہ کہانی رفعت کے لیے زیادہ دلچسپ ہوگی۔" دیسم خان نے انڈیا کے ایک اور شہر کا نام لے کر کہا — "میں وہاں کا رہنے والا ہوں۔ اپنی بہت ساری زمین تھی۔ بہت بڑی حیثیت تھی اور میں ماں باپ کا اکوٹا بچہ تھا۔ میں شہزادوں کی طرح بڑا ہوا۔ تمہاری

طرح شہزادوں کی طرح کالج میں پڑھتا رہا۔ کالج میں ہی تھا کہ میری شادی ہو گئی۔ وہ جاگیرداروں کے گھرانے کی بہت اچھی اور بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ ہم ایک دوسرے میں گھل مل گئے اور شادی کے تیسرے مہینے میرے والد صاحب فوت ہو گئے۔۔۔

"میرا ایک ماموں اور دو چچے تھے۔ چچے ہماری جائیداد کے پیچھے پڑ گئے۔ انہوں نے میری ماں کو دھکیاں بھی دیں اور مختلف طریقوں سے پریشان کرنے لگے۔ انہوں نے مجھے غائب کر دینے کی بھی دھکیاں دیں۔ صرف ماموں ہمارا اظہار تھا۔ ایک روز اس کی میرے چچوں سے لڑائی ہو گئی جس میں میرا ماموں قتل ہو گیا۔ چچہ مہینے بعد چچے صاف بری ہو کر آگے نہیری ماں کو میرے والد صاحب کا ہی غم بہت تھا۔ اب اس کا سکا بھائی بھی مارا گیا۔ یہ غم اسے لے بیٹھا اور وہ مر گئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ میں اُس وقت تقر ڈائری میں پڑھتا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیسے ہوا کہ تمام زمین کے مالک میرے چچے بن گئے۔ میرا زمین پر کوئی حق نہ رہا۔ میرے گھر کی شان و شوکت اسی زمین سے تھی۔ وہ نہ رہی۔ صرف جوہلی اور ماں کے زیورات اور کچھ نقدی رہ گئی۔۔۔

میں نے تعینم جاری رکھی۔ میری بیوی نے میرا خوب ساتھ دیا۔ وہ میرے لیے جذباتی سہارا تھی۔ میرے لیے معیبت کا دقت تو ابھی آ رہا تھا۔ میرے سسرال والے بڑے اچھے لوگ تھے مگر ان کا رویہ بدل گیا اور وہ مجھے پریشان کرنے لگے۔ کبھی طعنہ دیتے کہ میں ان کی بیٹی کی مندریات پوری نہیں کرتا۔ کبھی کہتے کہ وہ بیمار پڑ جاتی ہے تو میں اس کا علاج نہیں کرتا۔ ان کی ٹیٹھکایت بالکل صحیح تھی مگر میں اب کوئی نوکر نہیں رہا تھا۔ مجھ سے سسر اور ساس نے یہ کبھی بھی نہ پوچھا کہ دیسم، تم ماں باپ کے شہزادے تھے، اب کس طرح زندگی گزرتی ہے۔ ہمارے گھر سہی آج ہوا۔ انہیں تو یہ شکایت بھی تھی کہ میں تعلیم پر پیرہ صانع کر رہا ہوں۔ میری بیوی میکے جاتی تو اسے ماں باپ واپس نہ آنے دیتے۔ وہ واپس آتی تو اپنے ماں باپ کو ناراض کر کے ڈرہوتی آتی۔

”میں اتنا دل برداشتہ ہوا کہ حویلی بیچ ڈالی۔ بہت بڑی حویلی تھی۔ اچھی رقم مل گئی۔ میں اس شہر میں آ گیا اور یہ مکان خرید لیا جہاں میں رہتا تھا۔ نامی رقم بچ گئی۔ اس سے میں نے بی۔ اے کا آخری سال پورا کیا اور ڈگری لے لی۔ نوکری کی تلاش کی تو کوئی بگڑ نہ لی۔ میں جس محکمے میں ملازم تھا اس کے سب سے بڑے افسر کے پاس چلا گیا۔ وہ انگریز تھا۔ اسے بچپن سے لے کر اس روز تک کی آپ بیتی سنا دی اور اسے کہا کہ تمہاری بادشاہی میں مجھ پر یہ نظم ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان لوگوں کو سزا دی جائے۔ مجھے صرف نوکری چاہیے۔ وہ میری مصیبت کی روایت سے اتنا متاثر ہوا کہ مجھے نہایت اچھی نوکری دے دی۔ میں نے محنت اور دیا ندراری سے کام کیا۔ دو سال بعد ایک محکمہ انتظام پاس کر لیا۔ مجھے ترقی ملی گئی۔ یہ انگریز افسر مجھ میں خصوصی دلچسپی لیتا تھا اچھے سال اس نے مجھے ہبہ بھی دے دیا۔۔۔۔

”جو غم میں نے سہے وہ اچھے اچھے بہادروں کو پاگل کر دیتے ہیں۔ میرے اندر غم بھی تھا اور غصہ بھی۔ مجھے بڑا ہی غصیلا انسان ہونا چاہیے تھا لیکن میں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں نے دریا کے کنارے کنارے دور جا کر بلند آواز سے گانا شروع کر دیا۔ اور لوگ کہنے لگے دیرم زندہ دل آدمی ہے۔ بہت اچھا گاتا ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ جسے کوئی غم نہ بہو وہ زندہ دل اور گویا نہ ہو تو اور کیا ہو۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ میں سرایا غم ہوں اور میرا دل بڑی طرح مجروح ہے۔ مجھے بیوی کی یاد آتی تھی تو میں فی الواقع تڑپنے لگتا تھا۔ میں تصور دہن میں اپنی بیٹی سے پیار کیا کرتا تھا اور پیار کانشہ پورا کرنے کے لیے میں ہر اس انسان کے ساتھ محبت کرنے لگا جو کسی نہ کسی رنگ میں مظلوم تھا۔ میں نے اس کا کیا تھا کہ ساری عمر شادی نہیں کروں گا۔۔۔

”ایک روز ایک بیوہ کے متعلق پتہ چلا کہ دو سال پہلے تک اس کا خاوند زندہ تھا تو وہ فارغ البالی سے باپردہ زندگی گزارتی تھی۔ خاوند مر گیا تو لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگی۔

سسرال اسی شہر میں رہتے تھے۔ ایک روز بیوی نے مجھے بتایا کہ اس کے ماں باپ کو میرے خلاف دراصل نکالت یہ ہے کہ میری اب کوئی زمین نہیں اور میں ان کی حیثیت کے مطابق نہیں رہا۔ ہندوہ چاہتے ہیں کہ میں بیوی کو طلاق دے دوں۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے اپنی بیٹی مجھے نہیں میری جائیداد کو دی تھی۔۔۔۔

”میری بیوی کو پہلا تجربہ ہونے والا تھا۔ دن قریب آئے تو اسے ماں آگے گھر لے گئی۔ سات آٹھ روز بعد میری بیوی نے بچی کو جنم دیا۔ مجھے سسرال والوں نے اطلاع تک نہ دی کسی کی زبان پتہ چلا۔ میں خوشی خوشی گیا لیکن مجھے اپنی بیوی تک جاننے کی اجازت نہ دی گئی، نہ ہی میں اپنی بچی کو دیکھ سکا۔ میں وہاں بیٹھا رہا کسی نے پانی کا گھونٹ بھی نہ پوچھا۔ میں اٹھ کر آ گیا۔ تین چھینے میری بیوی نہ آئی۔ میں بھی نہ گیا۔ وہاں اب میرے لیے صرف ذلت تھی۔۔۔۔

”ایک روز مجھے اپنے سسر کا پیغام آیا کہ میں بیوی کو طلاق دے دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد مجھے دھکیاں ملنے لگیں۔ سسرال سے صاف جواب آ گیا کہ وہ میری بیوی کو نہیں بھیجیں گے۔ میں اکیلا تھا اور ناتجربہ کار۔ تمہارے جتنی عمر تھی۔ میں پکا گیا۔ ایک رات میرے گھر ڈاکہ پڑا۔ میری جان بچ گئی مگر گھر میں کچھ مسمی نہ رہا۔ زیورات، نقدی اور قیمتی چیزیں نکل گئیں۔ دوسرے دن سسرال سے پیغام آیا کہ طلاق نامہ لکھ دو۔ میں نے طلاق لکھ دی۔۔۔۔

”پولیس کو لوگوں کے زور دینے پر رپورٹ دی کہ میرے گھر ڈاکہ پڑا ہے۔ پولیس نے پوچھا کہ مجھے کسی پر شک ہے؟ میں جانتا تھا کہ ڈاکو میرے سسرال کے کرائے کے ڈاکو تھے۔ میں نے پولیس کو بتایا کہ مجھے کسی پر شک نہیں۔ مجھے صرف اپنی بیوی کا خیال تھا۔۔۔۔ مگر اب میں اسے اپنی بیوی نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کی دوسری شادی کر دی گئی۔ اس کا دوسرا خاوند اسی شہر کا ایک امیر زادہ تھا۔۔۔۔

اس آدمی نے دوسری شادی کی۔ دو سال بعد وہ بھی مر گئی۔ پھر اس شخص نے شادی نہیں کی۔ وہ اسی شہر میں آگیا اور یہاں کوٹھی بنائی۔ ان کی اراضی بہت تھی۔

دیسم خان نے باقی بات اس طرح سنا لی۔ ”میں اس راز سے پردہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ میں کسی کو اپنا ماضی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ میری بیوی بھی شک میں پڑ گئی کہ میں اب افسر اور امیر ہو گیا ہوں۔ اس لیے میں امیر کیرڑیکوں کو پسند کرنے لگا ہوں۔ رشید کو بھی شک ہو گیا کہ میں اس کے راستے میں حائل ہو گیا ہوں۔ میری مجبور یہ تھی کہ میں رفعت کو اپنی نظروں سے اوجھل نہیں کر سکتا تھا۔ رفعت بیٹا! تمہیں مجھ میں جو کشش نظر آئی تھی وہ میری سنگت مزاجی کی وجہ سے نہیں تھی۔ یہ تو خون کو پہچان لیا تھا۔ میں خوش تھا کہ تمہاری سنگتی رشید جیسے پیارے لڑکے سے ہو گئی ہے۔ میں تو تمہارے لیے آدھا جہیز تیار کر رہا تھا مگر رشید ایک لڑکے کو قتل کر بیٹھا۔ اس نے اچھا کیا کہ قتل کر کے میرے پاس آگیا اور میں نے اس سے تمام ضروری باتیں پوچھ لیں۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ میری بچی کا سہاگ اجڑ رہا ہے۔ میں رشید کو پھانسی کے تختے سے ہٹا کر وہاں خود کھڑا ہو گیا۔ دیکنگ کہتا تھا کہ وہ مجھے بری کر لے گا، میں اقبالی بیان سے مخرف ہو جاؤں لیکن میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے لیے یہی موت پسند کی۔“

تحریری وصیت کے مطابق دیسم خان نے اپنا مکان رفعت کے نام کر دیا تھا اور بنک میں اس کا چوبیس ہزار روپیہ جمع تھا، وہ بھی رفعت کے نام چھوڑ گیا تھا۔ دیسم خان کی لاش رفعت کے والد صاحب لے گئے تھے اور نہایت احترام سے تجزیہ دیکھنے کی مین رفعت کا دامنی توازن بگڑ گیا۔ اسی حالت میں اس کی شادی رشید سے کر دی گئی۔ اس سارے دانتے کا ایک نتیجہ یہ بھی سامنے آیا کہ رفعت کو اپنے آبا جنان سے نفرت سی ہو گئی۔ حالانکہ وہ اسے

اس کی ایک جوان بیٹی تھی جسے بعض لوگ عزت کی وجہ سے خراب کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ وہ غریب تھی اس لیے کوئی اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں لڑکی کی ماں سے ملا۔ رشتہ طے کیا اور چند ایک آدمیوں کو بٹھا کر اس کی بیٹی کو بیاہ لایا۔ میں نے شادی کی خاطر شادی نہیں کی تھی، ایک لڑکی کو پناہ دی تھی۔ وہ بڑی اچھی بیوی ثابت ہوئی۔ تین بچے پیدا ہوئے۔ تینوں مر گئے۔ وقت گزرا چلا گیا اور اٹھارہ سال انیس سال گزر گئے۔۔۔

”پھر وہ شام آئی جب تم دونوں اچانک میری زندگی میں داخل ہوئے۔ تم دونوں شاید دیکھ نہیں گئے تھے کہ رفعت کو دیکھ کر میں چونک پڑا تھا اور میں افسردہ ہو گیا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری پہلی بیوی آگنی ہے۔ نقش نگار میں ذرہ بھرق نہ تھا۔ اسی عمر میں وہ میرے گھر میں آئی تھی۔ میں نے انسانوں میں اتنی مشابہت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ رفعت کی شکل میری پہلی بیوی سے زیادہ ملتی تھی۔ مجھے یہ دھوکا ہوا جیسے میں اسے خراب میں دیکھ رہا ہوں۔ پھر ہم میں بے تکلفی پیدا ہو گئی تو میں نے رفعت سے اس کے والد صاحب کا نام پوچھا۔ اس نے نام بتایا تو میرے دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھی۔ میں نے اس سے اس کی اتنی کا نام پوچھا تو اس نے اتنی کا نام بھی بتایا اور یہ بھی کہ اس کی اتنی اس کے بچپن میں مر گئی تھی۔ میرے سارے دھوکے صحیح ثابت ہوئے۔ رفعت! تم میری پہلی بچی ہو۔“

رشید نے سنا یا کہ یہ سننے ہی رفعت کی یہ حالت ہوئی کہ وہ سلاخوں سے نکلانی اور ہاتھ اندر کر کے اس نے دیسم خان کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ جیل کا جو سنتری یا اس کھڑا تھا اس نے رفعت سے کہا۔ ”بی بی! ہاتھ باہر رکھو۔“ پھر دیسم خان کے ہاتھ باہر آ گئے۔ باب بیٹھی لے تو اس وقت لے جب ان کے درمیان سلاخیں اور موت حائل ہو چکی تھی۔ رفعت کی ماں کی شادی دوسرے آدمی سے کر دی گئی تھی۔ رفعت تین چار سال کی ہوئی تو اس کی ماں مر گئی۔

بہت چاہتے تھے۔ وہ پاکستان میں آکر فوت ہوئے۔ رفعت کے ساتھ ان کا پیار قائم رہا
لیکن رفعت ان سے کبھی کبھی لڑتا رہا۔

میں آج بھی حیران ہوں کہ دسیم خان نے یہ ڈرامہ کس خوبی سے کھیلا تھا۔ اس نے
رشید کی جگہ خود پھانسی کے تختے پر کھڑا ہونے کے لیے ہر وہ شہادت اور ثبوت مہیا کیا جو استغاثہ
کو قابل اعتماد بنانے کے لیے درکار تھا۔ اگر دسیم خان پولیس آفیسر ہوتا تو کامیاب سراغرساں
ہوتا مگر وہ باپ تھا۔ اپنی بچی پر قربان ہو گیا۔

بال ایک چڑیل کے

میرے پاس ایک لاش، ایک رومال، ایک
عورت کے چند ایک بال اور زمین پر کھڑے رہ
گئے تھے۔ باقی اندھا تھا جس میں ایک خوبصورت
چڑیل گم ہو گئی تھی۔

افسانہ نویس الفاظ میں جو حسن پیش کرتے ہیں وہ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔ شاید آپ نے دیکھا ہو۔ البتہ میری راستے یہ ہے کہ ہر کسی کی اپنی پسند ہوتی ہے لیکن آپ نے ایسی عورت کبھی دیکھی ہوگی یا شاید کبھی بھی نہ دیکھی ہو جسے دیکھ کر آپ بجلی کی کرنٹ کا جھٹکا محسوس کریں۔ چلتے چلتے رُک جائیں اور اس سوچ میں غرق ہو جائیں کہ اس عورت میں کیا ہے جس نے مجھے جکڑ لیا ہے۔

ایسی ایک عورت میں نے دیکھی تھی۔ اس کا رنگ گورا نہیں تھا۔ قد بوٹا نہیں تھا۔ آنکھیں موٹی موٹی نہیں تھیں۔ عمر سولہ سترہ سال نہیں تھی۔ زلفیں لمبی اور پھیلا رہیں تھیں۔ ہونٹ گلاب کی پتیاں نہیں تھے اور گال کشیر کے سبب کی طرح نہیں تھے البتہ ذرا چمکتے موتی ضرور تھے۔ اس کا رنگ سلاٹا تھا۔ وہ دیہات تھی جسے میں نے پہلی بار دیکھا تو اس نے بالوں میں لکھی نہیں کی ہوئی تھی اور منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ اس کے جسم سے مویشیوں کے گوبر اور اپنے پسینے کی بدبو آرہی تھی مگر میں نے اسے دیکھا تو میری تھانڈاری کانپ گئی تھی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ شاعر اور افسانہ نویس اس عورت کو دیکھ لیتے تو اپنی نظریں اور افسانے پھاڑ کر کوئی اور دھند شروع کر دیتے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ بوڑھے احمد یار خان نے یہ کیا جو انوں کی طرح خرافات شروع کر دی ہے۔ مگر صاحب، وہ عورت یاد آتی ہے تو میں بہت دیر گم سم بیٹھا رہتا ہوں۔ دراصل مجھ جیسے جذباتی آدمی کو تھانڈا رہنا ہوتا ہی نہیں چاہیے تھا۔ تو آوصاحب! آپ کو پہلے کہانی سنا دیتا ہوں پھر بتاؤں گا کہ گور سے رنگ کی عورت حسین ہوتی ہے یا سانوں نے رنگ کی، اور حسن ہوتا کیا ہے۔ میں حسب معمول اس کہانی کے اشخاص اور گادوں کے نام فرضی استعمال کروں گا کیونکہ ہو سکتا ہے ان تین خاندانوں کے افراد پاک

تین جوان آدمی دو دو دن کے وقفے سے قتل ہو گئے تو میرا سر جکڑ گیا۔ ایک ہی بار تین تفتیشیں سنبھالنا بڑا مشکل ہوتا ہے اور یہ شکل صرف اُسے پیش آتی ہے جو سچے دل سے تفتیش کرنا چاہے ورنہ آج کل ایک ایک تھانے میں ایک ایک سو قتل ڈکیتی، قتل شکنی اور چوری چکاری کے کیس رجسٹر کیے ہوتے ہیں اور تھانے کا عملہ اس طرح بے نیاز نظر آتا ہے جیسے اللہ نے ان کی سب مشکلیں آسان کر دی ہوں۔ قتل کی ان تین وارداتوں کی تفتیش سنانے سے پہلے میں آپ سے ایک نازیبا بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ حسین عورت کسے کہتے ہیں؟

مجھے معلوم ہے آپ کا جواب کیا ہوگا۔ رنگ گورا، قد بوٹا، آنکھیں موٹی موٹی، عمر سولہ سترہ سال، زلفیں لمبی اور پھیلا رہیں، ہونٹ گلاب کی پتیاں، دانت چمکتے موتی اور گال کشیری سبب کی طرح۔ شہروں میں حسن کو کسی اور طرح پرکھتے ہیں۔ لڑکی بال کٹوا کر، منگ منگ کر میوں کی طرح، انگریزی میں اردو بولے اور ہر طرح سے بے حیا ہو تو اسے بے حد حسین سمجھا جاتا ہے۔ دیہات والوں کا معیار ذرا مختلف ہے۔ شاعر اور

اور آدمی پھڑکا دیا ہے۔ میں ان لوگوں کو دیکھ کر انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ معمولی سی قسم کے دیہاتی تھے۔ وہ تھانے کے احاطے میں آگئے۔ میں نے وہیں سے پوچھا۔ ”زندہ ہے یا مر گیا ہے؟“ سب سے آگے جو آدمی آ رہا تھا اس نے جواب دیا۔ ”مر گیا ہے چوہدری صاحب۔“ اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ وہ اس کا باپ تھا۔ انہوں نے چار پائی برآمدے میں رکھ دی۔

لاش کے منہ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا۔ جوان آدمی تھا۔ چہرے کا رنگ گہرا نیلا ہو گیا تھا۔ ناک سے خون نکل کر اوپر والے ہونٹ پر جم گیا تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”بڑا ہی تیز زہر دیا ہے۔“

اس کے باپ نے رو ہانسی آواز میں کہا۔ ”ہاں چوہدری صاحب زہر دیا ہے۔“
”کس نے؟“

باپ نے سر ہلایا کہ معلوم نہیں اور وہ پھر دھاڑیں مارنے لگا۔ مقتول اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ ان لوگوں سے جو معلومات ملیں ان سے پتہ چلا کہ یہ غریب سا گھرانہ ہے۔ کسی کے ساتھ دشمنی نہیں نہ کسی پر شک ہے نہ شک کی کوئی وجہ ہے۔ وہ صبح روزمرہ کی طرح کھیٹوں پر گیا اور تقریباً بارہ بجے اس حالت میں واپس آیا کہ اس نے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھا ہوا تھا اور دوسرا سینے پر۔ آنکھیں باہر کئی ہوئی تھیں۔ گھر میں داخل ہوا تو صحن میں گر پڑا۔ ناک سے خون نکل رہا تھا۔ اٹھاتے اٹھاتے مر گیا۔ لوگ آگئے۔ سب نے کہا کہ تھانے لے جاؤ۔ اسے کسی نے زہر دیا ہے۔

مقتول کا نام قدیر تھا۔ اس کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ ابھی آٹھ بیٹے ہوئے تھے۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے قدیر کے ہاپ نے بتایا کہ میاں بیوی میں کوئی ناجاتی

میں موجود ہوں۔ میں گڑے مردے اٹھاڑتے ہوئے کسی خاندان کی نشاندہی کر کے اس کی توہین کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ اللہ سب کو عزت اور آبرو عطا کرے۔

وہ ہندوستان کے ایک دیہاتی علاقے کا تھانہ تھا۔ وہاں مسلمان دیہاتی، خاندانی دشمنیوں کی بنا پر، پانی لگانے کی باری پر، یاہ شادیوں اور رشتے ناٹوں کی ناچاقیوں پر ایک دوسرے کا خون بہاتے رہتے تھے۔ اس زمرے میں قتل کی جو وارداتیں ہوتی تھیں ان کی تفتیش میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ اس تھانے کا چارج لینے کے فوراً بعد میں نے علاقے میں مجبوں کا جال بچھا دیا اور ہر اس مسلمان اور سکھ خاندان کی دشمنیوں، پھلی لڑائیوں اور ان کے آئندہ ارادوں کی ہسٹری اپنے پاس محفوظ کر لی جن کے ہاں لڑائی جھگڑے اور خون خرابے ہوتے رہتے تھے۔ وہاں کے عادی لٹھ بازوں اور فسادوں کی فہرست بھی تیار کر لی۔ پولیس کے خوشامدیوں اور دو طرفہ مخبری کرنے والوں کے نام بھی لکھ لیے۔ چھ مہینوں میں میرے پاس دشمنی کے زمرے کی کچھ وارداتیں آئیں جن کی تفتیش میں میری فراہم کی ہوئی معلومات نے بہت مدد کی اور میں نے تھانے میں بیٹھے بیٹھے پوری کامیابی سے مقدمے قائم کر لیے۔

زہر بہت تیز تھا

ساتویں مہینے کے دوران ایک روز میں تھانے کے برآمدے میں بیٹھا تھا کہ مجھے چند آدمی آتے نظر آئے۔ چار کے کندھوں پر چار پائی تھی۔ چار پائی پر کوئی لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ایک ہیڈ کانسٹیبل ایشرسنگھ سے کہا۔ ”لو ایشرس، آج مسلمانوں نے ایک

کے کہیں میں مجھے یہی شک ہو رہا تھا۔

میں نے تعینت کی جو زمین اپنے ذہن میں بنائی وہ یہ تھی کہ اسے بیوی نے زہر دیا ہے یا بیوی کے ایما پر اس کے آشانے یا قدیر نے خود زہر کھرایا ہے۔ خود کشی کی وجہ اس کی اپنی بیوی کی بد چینی بھی ہو سکتی تھی اور اپنی جوان بہن کی بد چینی بھی۔ بد چینی بہن یا بیوی کو دیہاتی زندہ نہیں رہنے دیا کرتے لیکن بعض شریف خاندانیاں جہاں اپنے آپ کو فخر کر دیا کرتے ہیں۔

جب اس عورت کو دیکھا

کیس رجسٹر کیا۔ کاغذات تیار کیے اور لاش انہی لوگوں سے اٹھا کر گیارہ میل دور قصبے کے سول ہسپتال میں پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔ اپنے مجرموں کے حال کو مبرا کیا۔ انہیں ضروری دہایات بھیجیں۔ سورج غروب ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی جب میں مقتول کے گاؤں میں داخل ہوا۔ لوگ مجھے مقتول کے گھر تک لے گئے۔ میں نے تمام غیر متعلقہ لوگوں کو گھر کے اندر جانے سے روک دیا۔ اپنے دونوں کانٹیلوں کو بھی باہر ہی کھڑا ہونے کو کہا اور میں اکیلا اندر گیا۔ اندر گاؤں کی عورتیں ماتم کے لیے جمع تھیں۔ میں نے سب کو نکال دیا۔

گھر میں قدیر کے باپ کے علاوہ دو لڑکیاں رہ گئیں۔ ایک بلا شک و شبہ قدیر کی بہن تھی مگر دوسری کو دیکھا تو میں نے اپنے وجود میں بجلی کا دھچکا محسوس کیا۔ پھر اس طرح ہٹا جیسے بہت ہی تیزی سے میرے سر سے پاؤں تک بجلی کی کرنٹ گزر کر زمین میں چلا گئی

معلوم نہیں ہوتی تھی۔ سسرال کے ساتھ بھی تعلقات ٹھیک تھے۔ بیوی کے چال چلن پر کوئی شبہ نہیں تھا۔ قدیر کی ماں چھ سال ہوئے مر گئی تھی۔ اس کی ایک بہن تھی۔ عمر بیس سال کے قریب۔ غیر شادی شدہ تھی۔

”ضروری نہیں کہ میاں بیوی آپس میں لڑیں تو یہی ناچاقی کا پتہ چلتا ہے۔ میں نے قدیر کے باپ کو الگ بٹھا کر کہا۔ ”بعض اوقات میاں بیوی ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں لیکن کسی کو پتہ تک نہیں چلتا۔ اچھی طرح غور کرو اور مجھے بتاؤ کہ شادی کے بعد قدیر یا اس کی بیوی میں تم نے کوئی تبدیلی دیکھی تھی؟“

بوڑھے نے بہت سوچا۔ میں نے اسے سوچنے میں مدد دی۔ لقمے دیئے تو اس نے کہا۔ ”شادی کے ایک ماہ بعد قدیر چُپ چُپ رہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہنسی مذاق بھی کیا کرتا تھا لیکن ایک ہی مہینہ گزارا تو قدیر میں پہلے والی ہنسی نہیں رہی تھی۔“

”اور اس کی بیوی طبیعت کی کیسی ہے؟“

”جس طرح دیہات کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔“ باپ نے جواب دیا۔ ”اس میں کوئی شوخی نہیں۔ گھر کا کام کاج دلچسپی سے کرتی ہے۔ کھیتوں میں بھی جاتی ہے۔ قدیر کی بہن کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے۔ کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔“

میں اس کی ہر ایک بات پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے پہلے کسی کہانی میں آپ کو بتایا تھا کہ دیہات کے لوگ کسی قیمت پر تسلیم نہیں کرتے کہ ان کی بیٹی یا بہو یا ان کا بیٹا یا داماد بد چلن ہے۔ اپنے شادی شدہ بیٹوں کی ازدواجی زندگی کے متعلق وہ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ اس کی بیوی اسے بہت چاہتی ہے۔ یہ کوئی باپ برداشت نہیں کرتا کہ اس کے بیٹے کے متعلق یہ مشہور ہو جائے کہ اسے اس کی بیوی ناپسند کرتی ہے۔ قدیر

میں سمجھتا ہوں اللہ نے مجھے نیک نیتی کا انعام دیا ہے۔

زہر کا شک بیوی نے کیا

قدیر کی بیوی اندر آئی۔ میں نے قدیر کے باپ کو باہر بھیج دیا۔ میں نے اس عورت کو بہت ہی غور سے دیکھا۔ اس نے دو تین دنوں سے گلگلی نہیں کی تھی۔ اس کے چہرے پر اُداسی تھی۔ اس کا رنگ سا نولا تھا جو کالا بھی نہیں تھا، گندمی بھی نہیں تھا۔ جوانی کے خون کا جوش بہرے پر صاف نظر آتا تھا۔ اس کی جو کشش تھی وہ اس کی آنکھوں میں تھی یا ہونٹوں کی ساخت میں یا شاید دونوں نے مل کر اس کے چہرے کو پراسرار سا حُسن دیا تھا۔ سر کی گولائی اور پیشانی کی ساخت کی اپنی ایک دلکشی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی بناوٹ ایسی تھی کہ ہونٹوں کے کونوں پر مسکا اہٹ نظر آتی تھی۔ پھر اس کی گردن کی لمبائی تھی۔ اور ندانے اسے جو قد ثبت دیا تھا وہ نہ لمبا تھا نہ چھوٹا۔ عجیب طرح کا موزوں قد تھا۔ چال ایسی جو میں نے کم ہی کسی عورت میں دیکھی ہوگی۔ اس کے بکھرے ہوتے بے ترتیب بال مجھے بہت ہی اچھے لگ رہے تھے۔ اس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔

میں اس سے کوئی ایسا سوال نہیں پوچھنا چاہتا تھا جس سے اسے شک ہو تاکہ میں اس پر شبہ کر رہا ہوں۔ میں نے پوچھا۔ ”تہمارے خاندان کو زہر دینے والا کون ہو سکتا ہے؟“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اللہ جانتا ہے۔ مجھے کسی پر شبہ نہیں۔“

میں نے اس کے الفاظ پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس کے انداز کو غور سے دیکھا۔ مجھے کچھ بے تعلقی سی نظر آئی جیسے اسے اس کا اتنا افسوس نہیں جتنا ایک بیوی کو ہونا

ہو۔ میں بالکل بیان نہیں کر سکتا کہ اس میں کیا کشش تھی۔ میں پوری بے شرمی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ اس عورت کی خاطر اگر مجھے کسی آدمی کو قتل کرنے کی ضرورت پڑتی تو میں قتل کر گزرتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ تفتیش میں مجھے کہیں اور بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ قتل کا باعث یہی عورت ہے۔ اگر یہ واردات خود کشی کی ہے تو اس کا باعث بھی یہی عورت ہے۔ قدیر کی بہن کو میں نے بہت ہی گہری نظروں سے دیکھا۔ اپنے تجربے کی روشنی میں اس کی چال ڈھال کو پرکھا۔ وہ جوان تھی۔ شکل کی بری نہیں تھی لیکن دیکھنے سے اس پر بد چلنی کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاہم میں صرت دیکھنے سے اسے اچھے چلن کا سرٹیفکیٹ نہیں دے سکتا تھا۔

قدیر کی بیوی کو میں نے اندر بلا یا۔ میں صحن میں بیٹھنے کی بجائے کمرے میں جا بیٹھا تھا۔ مقتول کے باپ نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے پوچھا۔ ”چوہدری صاحب دودھ پینے گے یا پائے؟“ آپ رات کی روٹی ہمیں کھائیں گے۔ میں غریب آدمی ہوں قبول کر لیں۔ مگر میں مرغیاں ہیں۔“

میں نے اس کے ہاتھ پکڑ کر نیچے کیے اور کہا کہ میں ماقم واسے گھر بیٹھا ہوں۔ مرنے واسے کا ابھی جنازہ بھی نہیں پڑھا گیا۔ مجھے گناہ گار نہ کرو۔ میں اگر ساری رات یہاں بیٹھا رہا تو بھی کچھ کھاؤں بیوں گا نہیں۔ پیاس لگی تو پانی مانگ لوں گا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ کبھی کھانے پینے کا لالچ نہیں کیا تھا۔ روپے پیسے کا کوئی لالچ نہ تھا۔ اللہ نے اس کا مجھے صلہ دے دیا ہے۔ آج سزاؤ نچا کر کے بات کر سکتا ہوں اور اس سال تو خدا نے ایک معجزہ دکھایا ہے۔ میری اراضی کا علاقہ پانی میں ڈوب گیا ہے لیکن میری اراضی پانی سے صاف بچی ہوئی ہے۔ اگر دیکھیں تو آپ حیران ہوں گے۔ فصل کا ایک پودا اصناف نہیں ہوا۔

بھی اسے دیکھتے ہی کہہ دیا تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ اس کے چہرے پر جو کچھ یاد آ گیا تھا وہ دُور ہو گیا۔ میں نے اسے تسلی آمیز لہجے میں کہا: ”دیکھو تم گھبراؤ نہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں تم پر شک کر رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم عورت ذات ہو اور مسلمان ہو، تم تھانے اور کچہری نہ چرمحو۔ اسی لیے تمہارے گھر آ گیا ہوں ورنہ تمہیں تھانے بلا لیتا۔ میں یہ باتیں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ مجھے اس آدمی کا پتہ چل جائے جس نے تمہیں اس عمر میں بیوہ کر دیا۔ اس نے دھیمی آواز میں کہا: ”جس طرح اس کی کبھی تمہی پوری ہو گئی۔“

”قدریر صبح کیا کھا کر گیا تھا؟“
 ”صبح صرف دودھ پیا کرتا تھا۔ اس نے جواب دیا: ”آج بھی دودھ پی کر گیا تھا۔“
 ”دودھ اسے کس نے دیا تھا؟“

”اس کی بہن نے ڈال دیا تھا۔“
 ”دوپہر کی روٹی کس وقت کھاتا تھا؟“

”کبھی کھیتوں میں کبھی گھر میں۔ اس نے جواب دیا: ”جس روز گھر کھانی ہوتی تھی کہ جایا کرتا تھا کہ آج روٹی نہ لانا، گھر آ جاؤں گا۔“

”کھیتوں میں روٹی تم سے جاتی ہو یا اس کی بہن؟“
 ”ہمیشہ میں ہی لے جاتی ہوں۔“

”آج بھی تم گئی تھیں؟“
 ”نہیں۔ اس نے جواب دیا: ”آج تو روٹی گئی ہی نہیں۔ کہہ گیا تھا کہ گھر آ کر کھاؤں گا لیکن

وہ اس حال میں واپس آیا۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خالی پیٹ تھا۔“

چاہیے۔ میں نے قدریر کے باپ سے تھانے میں پوچھا تھا کہ جب قدریر مر گیا تو سب سے پہلے کس نے کہا تھا کہ اسے زہر دیا گیا ہے؟ اس نے جواب دیا تھا: ”سب سے پہلے قدریر کی بیوی نے کہا تھا۔“ پھر میں نے اسے کہا تھا کہ قدریر کی بیوی کے الفاظ کیا تھے؟ باپ نے بتایا تھا کہ قدریر کو ہم نے اٹھا کر چار پانی پر بھینکا تو اس کی بیوی نے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ مار کر کہا تھا: ”مائے اسے تو کوئی زہر دے گیا ہے۔“

میں نے یہ الفاظ خاص طور پر ذہن میں رکھے ہوئے تھے۔ یہاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ ملنے سے پہلے ہی تفتیش شروع کر دی تھی کیونکہ مقتول کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے کوئی تیز زہر دیا گیا ہے۔ میں نے پہلے بھی ایسی لاشیں دیکھی تھیں۔ میں نے قدریر کی بیوی سے پوچھا: ”تم نے کبھی زہر سے مراد ہوا آدمی دیکھا ہے؟“
 ”کبھی نہیں۔“

”پھر تم نے قدریر کو دیکھتے ہی کیوں کہا تھا کہ اسے کوئی زہر دے گیا ہے؟“
 وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکی۔ گھبرا گئی۔ میں نے ذرا حوصلہ دیا تو اس نے کہا: ”اُسے کوئی بیماری تو تھی نہیں۔ کھیتوں میں گیا تو بالکل ٹھیک تھا۔ مجھے صرف زہر کا شک تھا۔ میں نے نہ دیا۔“

میں نے اسے اس نقطہ پر گھیرنے کی کوشش نہ کی۔ میرے دل میں شک بیٹھ گیا کہ اس لڑکی کو علم تھا کہ آج اس کے خاندان کو زہر دیا جائے گا۔ ورنہ وہ یہ کہتی کہ اسے کسی نے مارا پیٹا ہے یا سانپ نے ڈس لیا ہے یا اسے اچانک اندر سے کوئی تکلیف اٹھی ہے یا وہ کچھ بھی نہ کہتی۔ یوں وثوق سے رائے نہ دیتی۔

میں نے اسے اپنے جال سے نکل جانے دیا اور کہا: ”تمہارا خیال ٹھیک تھا۔ میں نے

واضح ہوتی ہے، لیکن پیٹ کی جو کیفیت بیان کی گئی تھی وہ قدیر کی بیوی، بہن اور باپ کو جھٹلا رہی تھی۔ رات کو مجزوں نے آکر بتایا کہ قدیر کی بہن کا چال چلن صاف ہے۔ قدیر کی بیوی کے متعلق یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا کہ خراب تھی یا کسی کے ساتھ اس کے چڑی چھپے کے تعلقات تھے لیکن شک ضرور تھا۔ وہ اپنے خاندان کے گھر کی مگران تھی۔ جب جی چاہے اپنے گاؤں چلی جاتی تھی لیکن قدیر کا باپ اور بہن اس سے خوش تھے۔ قدیر کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ بیوی سے خوش تھا یا نہیں۔

میں دوسرے دن صبح صبح مقتول کے گھر چلا گیا۔ مجھے جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان سب کو کھانے بلا سکتا تھا لیکن میری کوشش یہ تھی کہ جوان لڑکیوں کو کھانے سے بچائے رکھوں۔ میں پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق وہاں گیا تھا۔ میں نے قدیر کے باپ کو اندر بلایا اور اس سے پوچھا۔ کل قدیر نے دن کی روٹی کہاں سے کھائی تھی؟ اس نے جواب دیا۔ اس کی روٹی نہیں گئی تھی۔

میں نے قدیر کی بہن کو بلایا اور اس کے باپ کے سامنے یہی سوال پوچھا۔ اس نے بھی یہی جواب دیا۔

میں نے قدیر کی بہن سے کہا۔ ”اچھی طرح یاد رکھو کہ بتاؤ کہ کل قدیر کے گھر آنے تک اس کی بیوی باہر گئی تھی؟“

اس نے سوچ کر جواب دیا۔ ”ہاں گئی تھی۔ یہ نہیں پتہ کہاں گئی تھی۔“

”گفتی دیر بعد واپس آئی تھی؟“

”زرا دیر بعد ہی آئی تھی۔“ قدیر کی بہن نے جواب دیا۔

”جب وہ گئی تھی تو اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی؟“

”ہاں۔ خانی پیٹ ہی ہوگا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس نے روٹی نہیں کھائی تھی۔“

”قدیر کی بہن کیسی لڑکی ہے؟“

”اُس نے چرونگ کر میری طرف دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سوال اس نے پسند نہیں کیا۔ میں نے اس کے چہرے میں تبدیلی بھی دیکھی۔ میں نے اسے کہا۔ ”میرا پوچھنے سے مطلب یہ ہے کہ بھن بھائی خراب بہنوں کی وجہ سے مارے جاتے ہیں یا اپنے آپ کو مار لیتے ہیں۔“

”یہ لڑکی خراب نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اگر میں کوئی ایسی بات دیکھتی تو اسے میں اپنے ہاتھوں ختم کر دیتی۔“

میں نے اسے باہر ہیج کر قدیر کی بہن کو بلایا۔ وہ ڈراؤر شرم کی وجہ سے بول ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے اس کے باپ کو اندر بلا کر اس کے پاس بٹھا دیا اور دونوں سے وہی باتیں پوچھیں جو قدیر کی بیوی سے پوچھی تھیں۔ انہوں نے وہی جواب دیے جو میں سن چکا تھا۔ مقتول کو دودھ بہن نے ڈال کر دیا تھا۔ اس میں سے اس نے باپ کو بھی دودھ پلایا تھا۔ قدیر کے لیے روٹی نہیں گئی تھی۔ قدیر کی بیوی کے خلاف دونوں نے کوئی بات نہ کی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان کے دل میں اس کے خلاف ذرا سی بھی کوئی بات ہے تو نکل آئے لیکن کوئی شکایت سامنے نہ آئی۔

پوسٹ مارٹم نے بیوی کو جھٹلا دیا

میں جب کھانے میں پہنچا تو رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ اچھی بنتی اور لاش ہسپتال سے گاؤں کے لوگ لے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ موت ذہن سے

طرح طرح کی اختیس دیتے ہیں جسے انگریز تھوڑا ڈگری کہا کرتے تھے۔ لیکن میں اس کے خلاف تھا۔ میں مشتبه کو کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ اس عورت کو بھی میں نے یہ تاثر دے کر آزاد رہنے دیا کہ میرا شک رفع ہو گیا ہے۔

میں جانے کے لیے اٹھا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میری نیت پر شبہ نہ کرنا۔ پولیس کو بہت سی ایسی حرکتیں کرنی پڑتی ہیں جو دوسروں کو اچھی نہیں لگتیں۔ اگر میری نیت خراب ہوتی تو میں تمہیں تھانے بٹالیتا۔
وہ پہلی بار مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں جادو کا اثر تھا۔

میں وہاں سے نکل کر گاؤں سے باہر چلا گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ قید کو روٹی کس نے کھلائی ہے۔ میں کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ سب سے پوچھا کہ کل قید کس جگہ کام کر رہا تھا۔ کسی نے بھی صحیح جواب نہ دیا۔ میں چلنا گیا اور ایک درخت کے نیچے مجھے دو کتے مرے ہوئے نظر آئے۔ قریب گیا تو ادھر ادھر پانچ چڑیاں مری ہوئی لگیں اور وہیں ایک گھری بھی مری پڑی تھی۔ زمین کچی تھی۔ وہاں صاف نشان تھے۔ دو تین آدمی وہاں بیٹھے رہے تھے۔

وہاں دو قسم کے کھڑے رپاؤں کے نشان تھے۔ ایک ننگے پاؤں کے جو حکیت سے درخت تک گئے تھے اور ایک جوتی واسے جو وہاں تک آئے بھی تھے اور گئے بھی تھے مگر گاؤں کی طرف نہیں گئے تھے۔ یہ کھڑے اور مرے ہوئے پرندے بتا رہے تھے کہ مقتول کو یہاں نہر دیا گیا ہے اور نہر دینے والا کوئی مرد ہے جو گاؤں کی طرف سے نہیں آیا تھا۔ نہر کھلا کہ ادھر ہی چلا گیا جہاں سے آیا تھا۔

میں نے گاؤں سے دو گھوڑے منگوائے۔ دونوں گھوڑے ایک کانسیٹیل کو دے کر

میں نے باہر سے اپنے ایک کانسیٹیل کو بلایا اور اسے اس گھر کی کسی عورت سے یہ پوچھنے کے لیے بھیج دیا کہ قید کی بیوی کل اس کے گھر کتنی دیر بیٹھی رہی تھی میں نے یہ ہدایت اسے الگ کر کے دی تھی۔ اندر آکر میں نے قید کی بیوی سے پوچھا۔ اس کے پیٹ میں روٹی کہاں سے آئی تھی؟
”میں کیا جانوں؟“

ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا تھا کہ معدے میں غیر معیہ شدہ گندم کی روٹی تھی جس میں نہر کی آئینہ ش پائی گئی۔ روٹی ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ پہلے معدے میں گئی تھی۔ قید کی بیوی کو یہی تھی کہ مقتول نے روٹی کھائی ہی نہیں تھی۔

میں نے اس خوبصورت عورت کو باتوں میں لگائے رکھا۔ اسے ڈرا یا دھمکایا بالکل نہیں۔ اشاروں اشاروں میں اسے یہ بتانے کی کوشش کرتا رہا کہ جذبات سے انصافی ہو کر بیویاں آشناؤں سے مل کر خاندانوں کو مرادیتی ہیں مگر ان کا احترام ہی بڑا ہوتا ہے۔ کبھی کوئی عورت بچ کے نہیں گئی۔ وہ شاید میرے اشارے سمجھ رہی تھی۔

مرے ہونے کو تھے، چڑیاں اور گھری

کانسیٹیل آگیا۔ میں نے باہر جا کر اس سے رپورٹ لی۔ اس گھر سے اسے پتہ چلا تھا کہ کل قید کی بیوی تھوڑی سی دیر کے لیے وہاں گئی تھی۔ اتنی دیر وہاں نہیں رہی جتنی وہ بتا رہی تھی۔ یہ اس کا دوسرا جھوٹ تھا۔ پولیس والے اس صورت میں پر طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ مشتبه کو، وہ عورت ہو یا مرد، تھانے لے جاتے ہیں۔ رات بھر جگائے رکھتے ہیں۔

کے سراغ سائون کرمات کرکتے ہیں۔

ہمیں کھوجی ڈیڑھ میل دوڑنے گیا اور آگے ریلوے لائن آگئی۔ کھوجی نے بتایا کہ وہ ریلوے لائن پر چڑھ گیا ہے۔ آگے کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کدھر گیا کیونکہ وہ ریلوے لائن کے درمیان چلنا نیا ہوگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ راستے میں کھوجی کے کہنے کے مطابق ٹرک کر پیچھے جو گھومتا رہا ہے وہ دیکھتا ہوگا کہ قدر نہ ہرکھا کہ ابھی کھڑا ہے یا گر پڑا ہے۔ قدر کے بیٹ میں جو روٹی تھی وہ اسی آدمی نے اسے کھلائی تھی اور اس کا قدر کی بیوی کو علم تھا۔

ریشمی رومال، عورت کے بال

کھوجی کو میں نے یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ یہ کھرا اپنی آنکھوں میں رکھے۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ اسے گھوڑے پر گاڑوں چھوڑ آئے میں تھانے چلا گیا۔ تنگن سے برہ حال تھا۔ میں نہنا رہا تھا تو داغ میں ایک بات آئی۔ میں نے یہ معلوم نہیں کیا تھا کہ قدر کی بیوی جس گھر میں گئی تھی اور کہتی تھی کہ وہاں بہت دیر رہی ہوں، اس گھر میں کوئی جوان آدمی ہے یا نہیں ہو سکتا ہے وہی اس کا دوست ہو اور وہ دیکھنے لگی ہو کہ وہ قدر کو نہر دینے چلا گیا ہے یا نہیں۔ میں نے اگلے دن کے لیے یہ بات نوٹ کر لی۔

انگلادن چڑھا تو میرے لیے ایک اور مصیبت آگئی۔ نبردرا اور چوکیہارا اطلاع لے کر مٹانے آئے کہ رحمت نام کا ایک جوان آدمی جس کی عمر چوبیس یا پچیس سال تھی، رات کو گاڑی کے نیچے آکر کٹ گیا ہے۔ لاش وہیں لائن پر پڑی ہے۔ میں نے پہلے تو اس حادثے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ یہ مین لائن تھی۔ بڑی تیز رفتار گاڑیاں گزرتی رہتی تھیں۔ یہ آدمی

ایک بوڑھے کھوجی کی طرف پہنچ دیا۔ معاملہ صاف تھا۔ قدر کو اس درخت کے نیچے روٹی کھلائی گئی تھی۔ بچے ہونے لگے۔ وہیں پھینک دیئے گئے جو کوؤں، چڑھیوں اور گہری نے کھائے اور سب مر گئے۔ یہ آدمی قدر کی بیوی کا دوست ہو سکتا تھا۔

کھوجی وہاں سے کوئی تین میل دوڑ رہا تھا۔ ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بعد کانسٹیبل اسے گھوڑے پر بٹھا کر لے آیا۔ میرے کہنے پر وہ زمین پر جھک گیا۔ ننگے پاؤں کا کھرا دیکھ کر اس نے بتایا کہ نہ آدمی اس کھیت سے کام کرتے کرتے درخت تک آیا تھا۔ کھوجی نے درخت سے دس بارہ قدم دور رک کر کہا۔ ”یہاں اس نے ایک آدمی کے ساتھ ٹرک کر بائیں کس بائیں ہاتھ تلایا۔ دونوں آنے سامنے کھڑے رہے۔ پھر اٹھے چلے اور یہاں (درخت کے نیچے) بیٹھ گئے۔ پھر ننگے پاؤں والا واپس کھیت میں چلا گیا اور جوتی والا اس طرف چلا گیا۔“ بوٹھا کھوجی جوتی والے کھڑے پر چل پڑا۔ کچھ دور جا کر اس نے کہا۔ ”یہاں ٹرک کر اس نے پیچھے دیکھا اور آگے چل پڑا۔“ پھر کچھ دور آگے جا کر اس نے کہا۔ ”یہاں بھی وہ رکا ہوا ہے اور پیچھے کو گھوما ہے۔“

اگر آپ کسی کھوجی کو کھرا اٹھاتے دیکھیں، اس کے ساتھ ساتھ چلیں، اس کی بائیں میں تو آپ ایسا محسوس کرنے لگیں گے جیسے آپ کسی جن کی بائیں من رہے ہیں۔ بعض جگہوں پر ہم اور آپ کو کوئی نشان نظر نہیں آئے گا لیکن کھوجی کو سب کچھ نظر آ رہا ہوگا۔ کھوجیوں کی بائیں بڑی پراسرار ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے کھوجی نے ایک جگہ ٹرک کر کہا۔ ”وہ یہاں کھڑا جوتی اتار کر جھاڑ رہا ہے۔ جوتی میں شاید نکلے گی آگئی ہے۔۔۔ یہاں وہ پھر ٹرک گیا ہے۔“ یہ بائیں بعض لوگوں کو ڈرا دیتی ہیں اور کھوجی بڑبڑا کر کی مانند نظر آنے لگتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس فن کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ اب تو یہ فن دم توڑ رہا ہے۔ یہ کھوجی سکاٹ لینڈ یا رڈ

کسی گاڑی کی ایش میں آگیا ہوگا یا اس نے خودکشی کی ہوگی۔ بہر حال فوری طور پر وہاں پہنچنا ضروری تھا۔

سبا کر دیکھا۔ لاش کے ڈکڑے ہو گئے تھے۔ کمر سے اوپر والا دھڑلان کے درمیان پڑا تھا اور نیچے والا دھڑلان سے باہر۔ گاڑی کے پیٹے کو کاٹتے گزر گئے تھے۔ مگر جسے میں سادہ یا خودکشی سمجھ رہا تھا وہ قتل کی واردات تھی۔ وہاں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا اور مرنے والے کے گھر کی عورتیں اور مرد ورہے تھے۔ فوری طور پر مجھے جو معلومات لوگوں سے اور مقتول کے لواحقین سے ملیں وہ یہ تھیں۔ اس کا نام رحمت علی تھا۔ غیر شادی شدہ تھا۔ وہ اسی گاڑی کا رہنے والا تھا جو قدیر کی بیوی کا میکہ گاڑی تھا۔ یہ گاڑی قدیر کے گاڑی سے تقریباً دو میل دور تھا۔

رحمت رات کا کھانا کھا کر گھر سے نکلا۔ رات بھر غیر حاضر رہا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ کسی نے اس کے گھر والوں کو اطلاع دی کہ رحمت کی لاش ریلوے لائن پر کٹی پڑی ہے۔ لاش جہاں پڑی تھی وہ جگہ قدیر کے گاڑی سے نصف میل یا پونے دو میل دور تھی رحمت کے باپ نے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر رحمت نے خودکشی کی ہے، مجھے یہ وجہ بتانی کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا جس کے ساتھ ہم کر رہے تھے مگر اس نے یہ کہہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے بوڑھے کو ابھی یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ اس کے بیٹے نے خودکشی نہیں کی۔

میں نے لاش کے دونوں ڈکڑے چار پائی پریڈ لائے۔ اس نے گرتے پہن رکھا تھا۔ وہ بھی کچلا گیا تھا۔ جبری طرح پھٹا تھا۔ اس کی پہلو والی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس میں سے ایک ریشمی رومال نکلا۔ اس کے کونے میں کانٹھ دی ہوئی تھی۔ میں نے کانٹھ کھولی تو

اس میں سے کسی عورت کے چند ایک بال گول گپھے کی صورت میں برآمد ہوئے۔ شہروں میں مقتولوں یا خودکشی کرنے والوں کی جیبوں سے محبت کے خطوط یا لڑکیوں کی تصویریں نکلتی ہیں اور دیہاتوں میں جو ناکام عاشق مرتے ہیں ان کے پاس لڑکیوں کی دی ہوئی عجیب عجیب سی نشانیاں ہوتی ہیں۔ رحمت جس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا اس کے متعلق کوئی نہیں جانتا تھا۔

مجھے اچانک یاد آیا کہ قدیر کی بیوی اسی گاڑی کی رہنے والی ہے۔ پولیس والوں کی ایک چھٹی حس بھی ہوتی ہے۔ میں نے سوچا کہ قدیر کی بیوی کہیں رحمت کو ہی تو نہیں پہانتی تھی؟ مگر یہ خیال بھی آیا کہ قدیر تو مر چکا ہے پھر رحمت کو کس نے قتل کیا؟ شاید وہ کسی دوسری لڑکی کو چاہتا ہوگا۔ وہ چونکہ رات بھر غیر حاضر رہا تھا اس لیے میں نے کھوجی کی ضرورت محسوس کی۔ میں نے اسی وقت کانسٹیبل کو اسی بوڑھے کھوجی کو لانے کے لیے بھیج دیا جس نے کانسٹیبل میں گھرا اٹھا یا تھا میرا ارادہ یہ تھا کہ وہ رحمت کے گاڑی کے باہر اس کا گھرا ڈھونڈے اور معلوم کرے کہ وہ کہاں کہاں گیا تھا۔ کھوجیوں کے لیے یہ کام مشکل نہیں تھا۔ رحمت کے پاؤں میں جوئی تھی۔ اسے مٹی پر رکھ کر کھڑے کی ساخت دیکھی جاسکتی تھی۔

ایک مشکل مزور پیدا ہو گئی تھی۔ دیہات کے سینکڑوں لوگ لاش دیکھنے کے لیے آگئے تھے۔ انہوں نے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دوڑتے کوئی گھرا سلامت نہیں رہنے دیا تھا۔ کھوجی نے لاش کی جوئی لے کر لاش کو غور سے دیکھا پھر تاشا بتوں کے ہجوم میں کسی ایسے جوان آدمی کو ڈھونڈنے لگا جس کا قد تبت اور جسم رحمت جیسا ہو۔ جب وہ لوگوں کو غور سے دیکھ رہا تھا تو لوگ وہاں سے کھٹکے لگے۔ میں نے سب کو روکا اور سمجھایا۔

کھوجی کو ایک آدمی نظر آگیا۔ اسے رحمت کی جوئیاں پہنائی گئیں۔ اتفاق سے اسے

تھا۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق موت رات کے پہلے پہر واقع ہوئی تھی اور لاش پر سے گاڑی کی دو بمش چار گھنٹے بعد گزری تھی۔ میں نے مقتول کے باپ سے کوئی دو گھنٹے صرف کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ کس لڑکی کو چاہتا تھا؟ اس کا دشمن کون تھا؟ مگر باپ کو کچھ بھی علم نہیں تھا۔ اس نے بتایا کہ رحمت کبھی کبھی رات کو گاؤں سے باہر چلا جاتا اور بہت دیر سے واپس آتا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ”قدیر کی بیوی تمہارے گاؤں کی رہنے والی ہے۔ اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“

”کوئی ایک سال پہلے رحمت نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ اس لڑکی کا رشتہ میرے لیے مانگو۔“ رحمت کے باپ نے کہا۔ ”لیکن ہم باہر کی ذات کا رشتہ نہ بیٹے ہیں نہ دیتے ہیں۔ ماں نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ اپنی ذات بڑاوری کی کسی لڑکی کا نام لو۔ اس نے کہا تھا کہ میں تمہارا رشتہ قبول نہیں کروں گا۔“

”تم نے رشتہ ڈھونڈا تھا؟ میں نے پوچھا۔“

”دو رشتے تلاش کیے تھے۔“ اُس نے کہا۔ ”مگر اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔“

”تو کیا یہ صحیح ہے کہ وہ قدیر کی بیوی کے ساتھ ہی شادی کرنا چاہتا تھا؟“

”اس نے صرف ایک ہی بار ماں سے کہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے اس لڑکی کا نام نہیں لیا۔ پھر اس لڑکی کی شادی قدیر سے ہو گئی۔“

”قدیر کی بیوی جب میکے آئی تھی تو وہ ان کے گھر جاتا تھا؟“

”بوڑھے نے سوچ کر جواب دیا۔ ”میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ گاؤں میں کبھی بات نہیں اُٹھی۔“

جوتی فٹ آگئی۔ اس کا جسم رحمت سے ملتا جلتا تھا۔ کھوجی نے لوگوں کو پیچھے ہٹا کر اس آدمی کو کچی زمین پر چند قدم چلایا پھر اس سے جوتی اتروا دی۔ اس نے زمین پر بیٹھ کر کھڑوں کو دیکھا۔ ہجوم پریشان طاری تھا۔ کھوجی جا دو گروں کی مانند نظر آ رہا تھا۔

اس نے کھڑوں کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر اس نے بڑی تیزی سے جھک کر کھرے کو دبا دیا اور اچانک اس نے زور سے زمین پر ہاتھ مارا۔ وہ اچھل کر اٹھا اور میرے قریب آ کر بولا۔

”یہ کھرا گل سے میری آنکھوں میں ہے۔ یہ مڑھی کھرا ہے جو میں کھیتوں سے اٹھا کر

ریلوے لائن تک لایا تھا۔“

کھوجیوں کے کمالات جس کسی نے دیکھے ہیں وہ جانتا ہے کہ کھوجی اگر کوئی گھرا ایک بار دیکھیں تو کئی کئی سال اسے نہیں بھولتے۔ شکل یہ ہے کہ کھوجیوں کی شہادت کو عدالت تسلیم نہیں کرتی۔ وہ صرف پولیس کی تفتیش میں مددگار ہوتے ہیں۔ جب اس بوڑھے نے کہا کہ یہ کھرا اس نے گل دیکھا تھا تو میں نے اس کی رائے کو فوراً تسلیم کر لیا مجھے یہ خوشی ہوئی کہ قدیر کا قاتل مل گیا ہے لیکن اب سوال یہ پیدا ہو گیا کہ اس قاتل کو کس نے قتل کیا ہے؟ وہ یقیناً قتل ہوا تھا۔ لائن پر خون بالکل نہیں تھا۔ گردن پر بے ہوشے خون کی گہری لال اور نیلی لیکریں بتا رہی تھیں کہ اس کا گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے پھر لائن پر پھینکا گیا۔“

مقتول کا قاتل مقتول

پوسٹ مارٹم رپورٹ نے تصدیق کر دی۔ رحمت کا گلا کسی نے ہاتھوں سے گھونٹا

” تمہیں معلوم ہے وہ گیا کہاں تھا؟“

” ہمیں بتا کر تھوڑے ہی جاتا ہے۔“ ماں نے کہا۔ ” صبح گیا اور شام کو آگیا۔“

یہ تو اب یقین ہو گیا تھا کہ قدیر کو زہر دینے والا رحمت ہے۔ کھوجی نے قدیر کے کھیت کے پاس درخت کے نیچے جو کھڑا دیکھا تھا وہ اسی کا تھا اور اب یہ سراخ بھی مل گیا تھا کہ رحمت قدیر کی بیوی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ لڑکی بھی اسے چاہتی تھی۔ اس کے خاندان قدیر کو رحمت نے زہر اس لیے دیا ہو گا کہ مقتول کی بیوی کے ساتھ شادی کر سکے مگر سوال یہ تھا کہ رحمت کا لگا کھونٹ کر اسے ریلوے لائن پر کس نے پھینکا؟ کیا قدیر کے کسی رشتہ دار کو ظلم تھا کہ قدیر کا قاتل رحمت ہے اور اس نے رحمت سے خون کا بدلہ لیا ہے؟ اور کیا قدیر کی بیوی کے تعلقات کسی اور آدمی کے ساتھ بھی تھے جس نے رحمت کو رقابت میں قتل کیا ہے؟ اور رحمت کی جیب سے جو رومال اور بالوں کا کچھ براہم ہوا ہے، کیا وہ قدیر کی بیوی کا دیا ہوا ہے؟

اب مجھے اندھروں میں ٹٹولنا تھا۔ میرے مخبر بھی کوئی کام کی خبر نہیں لا رہے تھے۔ قدیر کی بیوی کے متعلق وہ جو خبریں لائے تھے وہ میرے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔ اس کے متعلق زیادہ تر لوگوں کی رائے یہ تھی ”بنگال کی جادوگرنی ہے۔ جس مرد پر نظر ڈالے اس کی رُوح اس کے قبضے میں چلی جاتی ہے۔ کوئی مرد اس کے قبضے میں چلا جائے تو اس کے اشاروں پر نچتا ہے۔“

یہ محض بگپ بازی تھی۔ اس زمانے میں بنگال کا جادو مشہور تھا جو ایک بے بنیاد طریت تھی۔ قدیر کی بیوی کے متعلق جو رائے مجھ تک پہنچی تھی وہ ان آدمیوں کی تھی جو اسے چاہتے اور اس کے ساتھ تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے۔

” تمہارا کیا خیال ہے کہ رحمت نے خودکشی کی ہے؟“

” ہاں جی۔“ باپ نے کہا۔ ” وہ اندھا تو نہیں تھا کہ گاڑی کے نیچے آگیا۔“

میں نے آگے ہو کر آہستہ سے کہا۔ ” تمہارے بیٹے کو قتل کیا گیا ہے۔“

وہ بابرک کر بولا۔ ” قتل؟ میرے بیٹے کو کسی نے قتل کیا ہے؟“

” ہاں۔ قتل کیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ” لگا کھونٹ کر مارا پھر لائنوں پر پھینکا ہے۔ تمہیں کسی

پر شک ہے تو بتا دو۔“

” نہیں۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ” میری عونی دشمنی کسی کے ساتھ نہیں تھی۔“

” تمہاری نہیں تھی۔“ میں نے کہا۔ ” رحمت کی تھی۔ اٹھو۔ تمہارے گاؤں تک چلتا ہوں۔“

میں اس کے گاؤں میں گیا اور رحمت کی ماں اور دونوں بہنوں کو اپنے پاس بٹھا کر

پوچھا۔ ” قدیر کی بیوی جب جیکے آئی ہے تو تمہارے گھر آیا کرتی ہے؟“

” ہمارے گھر تو وہ سب سے زیادہ آتی ہے۔“ ایک بہن نے جواب دیا۔ ” بہت ہنسوت

ہے۔ پورا پورا دن ہمیں گزارتی ہے۔“

” رحمت کے لیے روٹی کھیتوں میں جاتی تھی یا گھر آ کے کھایا کرتا تھا؟“

” وہ کھیتوں پر جاتا ہی کہاں تھا۔“ اس کی ماں نے جواب دیا۔ ” بیکار پھرتا رہتا تھا۔“

” تین چار دن گزرے وہ روٹی اپنے ساتھ کیوں لے گیا تھا؟“

وہ سب حیران سی ہو گئیں۔ میرا سوال ہی ایسا تھا۔ میں نے پھر پوچھا۔ ” وہ کہیں

باہر گیا تھا؟“

” ہاں۔“ ایک بہن نے جواب دیا۔ ” کہتا تھا کہ میں شام کو آؤں گا۔ روٹی ساتھ

دے دو۔“

عائشہ خولصورت چربیل تھی

کی بھیدی ہوتی ہے مگر ہم معاشرے کو جب یہ بھید دکھاتے ہیں تو کسی کو بھی شرم نہیں آتی
نہ کوئی کان کپڑتا ہے۔

رحمت کے گاؤں میں بھی ایسی ایک عورت تھی۔ مجڑوں نے اس کے متعلق بتایا تو
میں نے اسے متھانے میں بلالیا۔ وہ بہت گھرائی لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ اسے
نہ تو ملزموں کی فہرست میں لیا جائے گا نہ گواہوں کی فہرست میں — میں نے دس روپے
کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس زمانے کے دس روپے آج
کے ایک سو روپوں کے برابر تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تقدیر کی بیوی اور رحمت کے
متعلق کچھ بتاؤ۔ اس نے جواب دیا۔

”عائشہ کی بات کرتے ہوئے — اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا — ”وہ اگر سارے گاؤں
کے مردوں کو کہے کہ ریلوے لائن پر لیٹ جاؤ تو سب لیٹ جائیں گے اور اوپر سے گاڑی گزر
جائے گی لیکن جو پھر ہی جی، آپ یہ چاہیں کہ آپ عائشہ کے جسم کی بو سونگھ لیں تو یہ آپ کا وہم
ہوگا۔ ابھی تک وہ مرد پیدا نہیں ہوئے جو عائشہ کو موم کر لے۔“ تقدیر کی بیوی کا نام عائشہ تھا۔
”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم نے کبھی اسے کسی آدمی کا پیغام
دیا تھا؟“
”صرف ایک آدمی کا...“
”کون تھا وہ؟“

مجھے تو قہقہے کہ وہ رحمت کا نام ہے گی لیکن اس نے ایک صاحب اولاد آدمی کا نام
لیا اور کہا۔ ”میرا جو حشر اس لڑکی نے کیا تھا وہ ساری عمر نہیں بھولوں گی۔ اس نے اپنی
شادی پر بھی مجھے اپنے گھر داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ اس کی شادی کے ایک سال پہلے

دیہاتی علاقوں میں ایک کردار اور بھی ہوتا ہے جو عموماً عورت ہوتی ہے۔ اس کردار
کو میں پوری طری بیان نہیں کرنا چاہتا کیونکہ بعض باتیں ذرا تنگی ہیں۔ یہ سمجھ لیجئے کہ یہ عورت
آسمان سے تار سے بھی توڑ لاتی ہے۔ اس کا کام ہوتا ہے اجرت لے کر دوستانے کرنا اور
خفیہ پیغام ادھر ادھر پہنچانا۔ یہ عورت ہر گھر میں جاتی اور سب کی خدمت کرتی ہے، چاہے
کوئی مرد اس سے سر یا ٹانگیں دلو لے چاہے کوئی عورت اس سے پیٹ ملو لے۔ وہ ہر
کسی کی بھیدی ہوتی ہے۔ ایسی عورتیں بہت ہی جنس کھ، ملنسا اور غم خوار ہوتی ہیں۔
ان کی باتوں میں جادو کا اثر ہوتا ہے۔ جسے چاہیں بیک میل بھی کر سکتی ہیں اور دوسروں
کے آنسو نکال دیں۔ یہ عورتیں اونچی ذات کی نہیں ہوتیں۔

یہاں میں یہ بھی کہہ دوں تو اچھا ہے کہ میں ذات پات کا قائل نہیں۔ یہ عورتیں جن
کام میں لڑکھیا ہے کہ اونچی ذات کی نہیں ہوتیں دراصل اونچی ذات والوں کی پیداوار
ہوتی ہیں۔ وہ انہیں روپیہ پیسہ اور دانے وغیرہ دے کر دوسروں کی بیٹیوں کے ساتھ
دوستانے کرتے ہیں لیکن انہوں نے کبھی بھی نہیں سوچا کہ یہ عورتیں جو ان کی خفیہ ایجنٹ
ہوتی ہیں خود ان کی بیٹیوں کے دوستانے دوسرے مردوں سے کراتی ہیں۔

میں ایسے کسی کہیں سنا سکتا ہوں جہاں اس قسم کی عورت نے ایک مرد کی دوستی کسی کی
بہن سے کرادی اور انسی مرد کی بہن یا بیوی کی دوستی کسی اور سے کرادی۔ یہ خباث پاکستان
بننے سے پہلے بھی موجود تھی اور پاکستان کے دیہات میں اب بھی موجود ہے۔ پولیس معاشرے

کی بات ہے۔ میں آپ کو سچی بات بتا دوں؟..... عائشہ عورت نہیں، بڑی خوبصورت چڑیل ہے۔ اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے۔“

”رحمت کے ساتھ اس کا کیا تعلق تھا؟“

”خدا جانتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”گاؤں کے کسی اور مرد یا عورت کا بھید پوچھ لو۔ پیٹ کے بھید بھی بتا دوں گی لیکن عائشہ کے متعلق کچھ نہ پوچھو۔ بہت گہری رطکی ہے۔ رحمت اس کے ساتھ شادی ضرور کرنا چاہتا تھا لیکن میں عائشہ کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتی۔“

اس نے جس صاحبِ اولاد کا نام لیا تھا کہ وہ عائشہ کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا تھا اس کے متعلق پتہ چلا کہ کچھ نہیں گزرے، مر گیا ہے۔ میرے سامنے اب پھر اندھیرا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف ایک رد مال، ایک عورت کے چند ایک بال اور رحمت کے پاؤں کا نشان تھا۔ مگر یہ کھرا مجھے یقین میں مدد دے سکتا تھا، عدالت میں نہیں۔ میں نے قدیر اور اس کی بیوی کے قریبی رشتہ داروں کی فہرست تیار کی۔ مجھے شک تھا کہ ان میں سے کسی نے اسی شک یا یقین پر رحمت کو قتل کیا ہے کہ اس نے قدیر کو زہر دیا ہے۔

ایک اور قتل

میں تفتیش کی نئی لائن بنا رہا تھا کہ صبح کے وقت ایک شاہ جی، نمبردار اور دو اور آدمی تھانے میں آئے۔ انہوں نے رپورٹ درج کرائی کہ شاہ کا بیٹا جس کی عمر بائیس تیس سال تھی، کھیتوں میں مرا پڑا ہے۔ وہ سب بہت ڈر سے ہوئے تھے۔ پہلے قدیر مراد دو روز بعد رحمت مر گیا اور اس کے دو روز بعد شاہ کا بیٹا مر گیا۔ ایک آدمی نے ہاتھ جوڑ کر

رومانسی آواز میں کہا۔ ”ٹھنور، یہ کوئی شہر شہر معلوم ہوتا ہے ورنہ ان (شاہ جی) بادشاہوں کی اولاد پر کون ہاتھ ڈال سکتا ہے۔“

مجھے اس شاہ سے اور اس جیسے ہر ایک شاہ سے نفرت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو میری تعلیم ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جتنی حقیقتیں میں نے دیکھی ہیں دیا پولیس انسپکٹر دیکھا کرتے ہیں) ان کے سامنے شاہوں اور پیریوں کے تعویذ اور کالے جادو و محض فراڈ ہیں۔ لوگ بے چارے ان پر ٹھہر اور توہم پرست ہوتے ہیں، ان کے جال میں بھنس جاتے ہیں۔ اب یہ شاہ اپنے بیٹے کے قتل کی رپورٹ درج کرانے آیا تو میں نے بے اختیار اسے کہا۔ ”شاہ صاحب، آپ تو زمین اور آسمان کا حال جانتے ہیں۔ جتن اور چڑیلیں آپ کے قبضے میں ہیں۔ اپنے بیٹے کے قاتل کے متعلق آپ کچھ نہیں جانتے؟“

چونکہ شاہ کے ساتھ نمبردار اور گاؤں کے دو آدمی تھے اس لیے ان پر رعب جمانے کے لیے اُس نے غصے سے جھوم کر کہا۔ ”اگر میرے بیٹے کا قاتل کوئی جتن بھڑا یا کوئی چڑیل ہوئی تو دیکھنا چوہدری، ساری دنیا کے سامنے اس کے سارے خاندان کو جلادوں گا۔“

میں نے اس دوران قدیر کی بیوی کو آزاد رکھا۔ اس کے گھر نہ خود گیا نہ کسی کو بلایا۔ اب

مجھے شاہ کے بیٹے کی موت کی اطلاع ملی تو میں ان کے ساتھ موقعہ دیدادت پر پہنچا۔ شاہ کا مکان قدیر کے گاؤں سے کوئی اڑھائی یا تین فرلانگ دُور تھا۔ مکان کے آگے اس نے بانچہ بنا رکھا تھا۔ جناب بڑی شان سے الگ تھلک جاگیر میں رہتے تھے۔ اس کے مکان اور قدیر کے گاؤں کے درمیان کھیت اور درخت تھے۔ اس کے بیٹے کی لاش ان کھیتوں میں پڑی تھی۔ رات کے پچھلے پہر آدھی چلی اور سوتوڑی سی بارش بھی ہوئی تھی جس سے یہ نقصان ہوا کہ کھڑے صانع ہو گئے تھے۔ لاش ایک مینڈھ پر پڑی تھی۔ منہ کھٹا ہوا، زبان باہر

بیچ دیا اور میں خود شاہ کے ڈیرے پر چلا گیا۔ اسے انگ بٹھا کر پوچھا کہ اسے کسی پر شک ہے؟ اس نے ایک پیر کا نام لیا جو وہاں سے تین میل دور رہتا تھا۔ کہنے لگا۔ ”وہ میری شہرت اور میری کرامات سے جلتا ہے۔ مجھے اس پر شک ہے۔ اسے تھانے بلا کر پھینٹی چڑھا دو۔“

”کوئی اور بات کرو شاہ صاحب۔“ میں نے اسے طنز یہ لہجے میں کہا۔ اپنے بیٹے کے قتل کی باتیں کرو۔ کاروباری حسد کی باتیں چھوڑ دو۔ میں جو پوچھتا ہوں وہ صاف صاف بتاؤ۔ رات کو آپ کے ہاں کون کون سی عورت آئی تھی؟“ اس نے آنکھیں بند کر کے ادر اپنے اوپر وجد طاری کر کے کہا۔ ”یہاں تو ساری دنیا آتی ہے۔“

”میں پوچھتا ہوں عورت کون کون سی آئی تھی؟“ میں نے ذرا رعب سے پوچھا۔ مگر وہ اپنے آپ کو دیہاتیوں کا روحانی بادشاہ بلکہ خدا سمجھتا تھا، اس نے رعب کے جواب میں رعب سے مجھ سے پوچھا۔ ”تم مجھ سے ایسی باتیں کیوں پوچھتے ہو؟ عورت کوئی بھی آئی ہو تمہیں اس سے کیا؟ تم تفتیش کر کے بتاؤ کہ میرے بیٹے کو کس نے قتل کیا ہے؟“

”تمہارے بیٹے کو ایک عورت نے قتل کیا ہے۔“ میں نے غصہ پی کر اطمینان سے کہا۔ میں نے اپنا اصول بنا رکھا تھا کہ کوئی مجھے گالی بھی دے، میں غصہ پی جایا کرتا تھا۔ اکثر تھا نیدار خود سرقم کے گواہوں اور طنزموں پر تشدد شروع کر دیتے ہیں اور تفتیش سے نوجہ ہٹا کر لوگوں پر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہم تھانیدار ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آنیس میں کوئی تعاون نہیں کرتا۔ میں نے شاہ کا رعب پی لیا اور کہا۔ ”تمہارے بیٹے کو ایک

آئی ہوئی، آنکھوں کے ڈھیلے باہر آئے ہوئے، مٹھیاں بھیجنی ہوئیں اور وہ پیٹھ کے بل پڑا تھا۔ میں نے گردن کو غور سے دیکھا۔ اس کا گلا ہاتھوں سے گھونٹا گیا تھا۔

میں نے سب کو وہاں سے دور چلے جانے کو کہا۔ میرا اپنا ایک طریقہ کار تھا۔ موقعہ دارانہ سے بعض اوقات کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جو دوسروں کو نظر بھی نہیں آتی اور اگر نظر آجائے تو شہری اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ پولیس کے لیے ایسی چیزیں بہت ہی اہم ہوتی ہیں۔ ایسی چیزیں تماشائیوں کی نظروں سے اوجھل ہی رکھی جائیں تو زیادہ فائدہ مند ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تماشائیوں میں قاتل بھی موجود ہو۔ اسی لیے میں نے سب کو دور چلے جانے کو کہا اور خود لاش کے ارد گرد کی زمین دیکھنے لگا۔

کوئی گھرا صاف تو نہیں تھا لیکن زمین صاف بتا رہی تھی کہ یہاں قاتل اور مقتول میں خاصی دھندلا مٹی ہوئی ہے اور مقتول قاتل کے ہاتھوں میں تڑپ تڑپ کر رہا ہے۔ سوچ نکل آیا تھا۔ زمین پر کوئی چیز دھوپ میں چمکی۔ میں نے بیٹھ کر دیکھا۔ یہ چھوٹا سا ایک موتی تھا جو عورتوں کے کانوں میں ڈالنے والے کانٹوں میں لگا ہوتا ہے۔ یہ زلیور میں چڑھتا ہوتا ہے۔ میں نے یہ موتی یا اسے آپ نگ کر لیں، اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

کام کی ایک چیز اور مل گئی۔ مقتول کی مٹھیاں بند تھیں۔ دونوں مٹھیوں میں کسی عورت کے لیے لمبے بال تھے۔ ایک مٹھی میں تین بال تھے اور دوسری میں پانچ بال۔ کچھ بال بہت لمبے تھے اور کچھ ٹوٹے ہوئے۔ یہ مٹھیوں میں تھے اور انگلیوں کے درمیان سے باہر نکلتے ہوئے تھے۔ میں نے بال مٹھیوں میں سے نکال لیے۔ انہیں اپنی انگلی پر لپیٹ کر گچھا بنایا اور جیب میں ڈال لیا۔ وہاں کے تین آدمیوں کے ابتدائی اور رسمی بیان قلم بند کیے۔ انکو ٹھے گوائے اور لاش چارپائی پر ڈلو کر سول ہسپتال بھیج دی۔ ایک کانسٹیبل ساتھ

عورت نے قتل کیا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“ اُس نے پوچھا۔

”جس پر جناب کی بھی نظر کم تھی اور جناب کے بیٹے کی بھی۔“ میں نے کہا۔ وہ اپنے مخصوص انداز سے کچھ بولنے لگا تو میں نے ڈرا دیکھ کر کہا۔ ”دیکھو شاہ، میں چاہوں تو تمہیں ہی اپنے بیٹے کے قتل کے شے میں تانہ دے سکتا ہوں۔ ایک جوان آدمی قتل ہو گیا ہے۔ یہ تمہارا نہیں، گورنمنٹ کا کیس ہے۔“ میں نے اسے آپ کہنا چھوڑ دیا۔ میں نے کہا: ”تمہارے بیٹے کے قتل کا باعث تمہارے گھر میں تھا اور وہ تمہاری نظر میں ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے ڈیرے میں جو عورتیں یا جوان لڑکیاں آتی ہیں اور جن کو تم خراب کرتے رہتے ہو ان میں کوئی ایسی ہے جس کے متعلق تم یہ کہہ سکو کہ اسحاق کی بہت پکی ہے؟“

”تم مجھ پر غلط الزام نہ لگاؤ۔“ اس نے ذرا ذہنی زبان میں کہا۔

بال ایک چڑیل کے

اس کا رعب مر گیا تھا لیکن وہ یہ تسلیم کرنے پر راضی نہیں تھا کہ وہ عورتوں کو خواب کرتا ہے۔ میرے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ شاہ کے بیٹے نے کسی عورت پر ہاتھ ڈالا ہے اور اس عورت نے اسے ختم کر دیا ہے۔ اس کی ٹھٹھی میں عورت کے بال اور لاش کے قریب کانٹے کا موتی بتا رہا تھا کہ قاتل عورت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ قاتل کوئی مرد ہو۔ شاہ کے بیٹے نے اس عورت کو پکڑ رکھا ہوگا اور اس کے ساتھ جو آدمی تھا اس نے شاہ کے بیٹے کا گلا گھونٹ کر مار دیا ہوگا۔ یہ آدمی اس عورت کا بھائی یا خاوند ہو سکتا تھا۔

میں اس سوچ سے پریشان ہونے لگا کہ دیہات کے یہ گنوار لوگ شاہوں اور پریوں کو تو خدا کے بعد کا درجہ دیتے ہیں۔ اپنی بہو بیٹیوں کو اکیلے ان کے ڈیروں پر بھیج دیتے ہیں۔ ان میں ایسا جراثیم والا کون ہے جس نے شاہ کے بیٹے کو قتل کر دیا ہے؟۔ میرا دماغ مجھے بار بار قدیر کی بیوی کی طرف لے جاتا تھا۔ میں نے اس کے گھر پوچھ گچھ کے دوران اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کا رد عمل دیکھا تھا۔ پھر اس عورت نے بھی اس کے متعلق بتایا تھا کہ عائشہ غم بصورت چڑیل ہے۔ اس کے اندر زہر بھرا ہوا ہے۔

”قدیر کی بیوی عائشہ تمہارے پاس آتی ہے؟“ میں نے شاہ سے پوچھا۔

”کبھی کبھی“

”رات آتی تھی؟“

وہ جھینپ گیا۔ میں نے اس کے چہرے کا بدلہ ہوا دمک دیکھ کر کہا: ”میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ اپنے بیٹے کے قاتل کو پھانسی چڑھانا چاہتے ہو تو دل کی ساری باتیں میرے آگے لکھ دو۔ تم نہیں بتاؤ گے تو مجھے دوسرے لوگوں سے تمام باتوں کا علم ہو جائے گا۔ پھر میں تمہیں اپنے بیٹے کے قتل کے شے میں گرفتار کروں گا۔ تمہاری پوری مریدی بالکل ختم ہو جائے گی۔ شہادت کو چھپانا جرم میں اعانت کے برابر ہوتا ہے۔ یہ جرم قتل کا ہے۔ قتل میں اعانت کی سزا عمر قید بھی ہو سکتی ہے۔ اپنے بچوں چڑیلوں کو ذرا بھول جاؤ۔۔۔“

رات عائشہ تمہارے پاس آتی تھی؟

”نہیں“

”دن کے وقت آتی تھی؟“

”ہاں“

تسلی دی اور کہا کہ جو کچھ لڑکھوں وہ صاف صاف بتا دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے سر سے دوپٹہ نہیں اترنے دوں گا۔ اب کوئی بات چھپا بھی نہیں سکو گی۔

”پوچھو پوچھو ہر سی جی۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”رات کو تم شاہ کے گھر کیوں نہیں گئی تھی؟“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے کانوں میں سونے کے کانٹے تھے۔ میں نے دونوں کانٹے غور سے دیکھے۔ ایک میں تین باریک سفید موتی مثلث میں جڑے ہوئے تھے۔ دوسرے میں دو موتی تھے۔ تیسرے کی جگہ خالی تھی۔ یہ موتی میری جیب میں تھا اور وہ دو مال بھی میری جیب میں تھا جو رحمت کی لاش کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔ اس کے کونے میں بال بندھے ہوئے تھے۔ اور جو بال شاہ کے بیٹے کی مٹھیوں سے نکالے تھے وہ بھی جیب میں تھے۔

”عائشہ۔“ میں نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر کہا۔ تم راستے سے واپس آگئی تھی۔“

اس کی آنکھیں باہر کو آنے لگیں۔

”میں تمہیں پھر کہتا ہوں کہ گھبراؤ نہیں۔“ میں نے اسے پھر تسلی دی۔ میں مسلمان ہوں۔ ہندو یا سکھ نہیں۔“

گمروہ بگڑ گئی۔ پختہ آواز میں بولی۔ ”میں رات کہیں نہیں گئی تھی۔“

”تم رات گئی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم واپس کہاں سے آئی تھی۔“

”کہاں سے؟“

”تم نے اسے رات کو آنے کے لیے کہا تھا؟ میں نے ایک تنگ کے تحت پوچھا۔

”کہا تو تھا۔“ وہ پھر جھمک گیا۔ ”لیکن۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ یہ کہہ کر وہ عجیب سی طرح ہنس پڑا۔

کہنے لگا۔ ”وہ بڑی اگھڑی رہتی ہے۔“

میں ساری بات سمجھ گیا۔ میرے لیے اتنا ہی فقرہ کافی تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم نے

اسے کہا تھا کہ رات کو آنا تعویذہ فعل گا۔“

”کہا تو یہی تھا۔ اس نے کہا۔

”وہ تعویذہ کیوں لینے آئی تھی؟“

”اس کا خاوند مارا گیا ہے۔ مجھے صرت اتنا ہی کہتی تھی کہ شاہ جی دعا کرو خدا میری نیکیں آسان کرے۔ میں بہت بڑے پتھر میں آگئی ہوں۔“

تیسرا موتی میری جیب میں تھا

میں نے یہاں پہنچ کر اس سے کچھ بڑی ہی تنگی بائیں پوچھیں۔ شاہ نے مجھے یقین دلادیا کہ عائشہ اس کے ہاتھ نہیں چڑھی تھی۔ وہ اپنا جسم دینے کو کبھی تیار نہیں ہوئی تھی۔ میں یہی سنا چاہتا تھا۔ میں وہیں سے قدیر کے گھر چلا گیا۔ یوں معلوم ہوا تھا جیسے خدا نے مجھے اندھیرے میں روشنی دکھا دی ہے۔ قدیر کے گھر جا کر میں نے قدیر کی سہیلی کو اندر اپنے پاس بٹھالیا۔ اس کے پہرے پر صاف تبدیلی تھی۔ گھڑاٹ اور ڈرکا اثر صاف تھا۔ لیکن وہ مجھے پہلے سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی اور اب مجھے پتہ چلا کہ اس کے حُسن کی اصلیت کیا ہے۔ یہ اس کے اندر کا حُسن تھا۔ میں نے اسے بہت

”جہاں تم اپنے کانٹے کا یہ نگ پھینک آئی تھی“ میں نے جیب سے سفید موتی نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھا اور اسے دکھایا۔ ”بائیں کان والا کاٹنا مار کر دیکھو“

اس نے تیزی سے اپنا کانٹا مارا۔ دیکھ کر اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ میں نے جیب سے وہ زرد مال نکلا جو رحمت کی لاش سے برآمد ہوا تھا۔ اس کی کانٹھ کھولی۔

رومال اور بالوں کا گچھا اس کے آگے کر دیا۔ اس نے نہایت آہستہ آہستہ ہاتھ آگے کیا اور رومال پر رکھ دیا۔ دھیمی سے آواز سے پوچھا۔ ”یہ آپ کو کہاں سے ملا؟“ اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

”رحمت کی جیب میں تھا“

وہ دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ میں جان گیا کہ وہ چیخیں مار کر رونا چاہتی ہے۔ وہ عورت تھی۔ عورت مرد سے زیادہ دلیر ہو سکتی ہے لیکن جذبات کی کمی ہوتی ہے۔ میں نے جیب سے دوسرے بال نکالے اور کہا۔ ”یہ بال بھی تمہارے ہیں۔ شاہ کے بیٹے کی لاش کی مٹیوں میں تھے۔ یہ بال بھی تمہارے ہیں جو رحمت نے رومال میں باندھ رکھے تھے۔ تمہارے خاندان کو رحمت نے زہر دیا تھا“۔ مجھے ابھی بالکل یقین نہیں تھا کہ یہ بال اسی کے ہیں۔ اس کے ہونٹ کاٹنے لگے۔ وہ ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر ساکن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کبھی ادھر دیکھتی کبھی دوسری طرف سر گھماتی۔ وہ سخت بے چین ہو گئی تھی۔ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے دروازے کی طرف دیکھا جیسے وہ بھاگ جانا چاہتی ہو۔ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور کہنے کر بٹھایا مگر وہ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اچانک چلا کر کہا۔ ”تم مردکتے ہو۔ رحمت بھی کتا تھا۔ شاہ کا بیٹا بھی کتا تھا۔ شاہ بھی کتا ہے۔“

میں نے اٹھ کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور کہا۔ ”اور میں نہ ہاں بھائی ہوں۔“

”اس نے چہرہ میرے ہاتھ سے چرٹانے کی کوشش کی اور کہا۔“ ”میرا کوئی بھائی نہیں۔“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر زور سے دھکا دیا اور محمد دھڑام سے فرش پر بیٹھ گئی۔ بولی۔ ”پوچھو کیا پوچھتے ہو؟ میں سٹوری پر چرٹھنے کے لیے تیار ہوں۔“ اس نے فرش پر زور زور سے ہاتھ مار مار کر کہا۔ ”میں نے رحمت کو میں نے قتل کیا ہے۔ شاہ کے بیٹے کو میں نے قتل کیا ہے۔ بتا اور کیا پوچھتا ہے تو؟“

.... اور دل کے زخم

اُس وقت وہ اتنے زیادہ تہر اور غمے میں تھی کہ مجھے شک ہوا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہے۔ اس کے دانت اس طرح دکھائی دینے لگے جیسے کوئی خوبصورت چڑیل ہو۔ میں نے بڑی ہی خشک سے اسے ٹھنڈا کیا اور اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ آرام سے بات کرے، میں اس کی مدد کروں گا اس پر وہ رونے لگی۔

اس نے جو لمبا چوڑا اقبال جزم کیا وہ مختصر الفاظ میں اس طرح ہے کہ وہ شریفین ماں باپ کی بیٹی تھی۔ جوان ہوئی تو اسے رحمت اچھا لگنے لگا۔ رحمت نے بھی اسے دل و جان سے چاہا۔ اس نے قسمیں کھا کر بتایا کہ ان کی محبت پاک تھی۔ رحمت نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرے گا، لیکن اس کے ماں باپ نہ مانے۔ عائشہ کا رشتہ قدیر کے ساتھ طے ہو گیا۔ رحمت نے اسے کہا کہ گھر سے بھاگ چلتے ہیں لیکن عائشہ نہ مانی۔ اس نے اسے کہا کہ ماں باپ نے معلوم نہیں کیسی کیسی امیدوں سے پالا ہے، میں ماں باپ کی عزت کا دل میں خراب نہیں کروں گی۔ تم اپنے ماں باپ کو راضی کرو

آٹھ مہینے گزر گئے۔ رحمت نے عائشہ کو ایک دن کہا کہ وہ قدیر کو راستے سے ہٹائے گا پھر ماں باپ کو عائشہ کے ساتھ شادی کرنے کے لیے رضامند کرے گا۔ عائشہ نے مجھے بتایا کہ وہ اس کی بات سمجھ نہ سکی۔ وہ سمجھی کہ وہ قدیر کو طلاق پر راضی کرنے کا بلکہ بعد میں وہ اس کی اس بات کو مذاق سمجھتی رہی۔

تین روز بعد قدیر اس حالت میں گھر آیا کہ ایک ہاتھ پیٹ پر اوردوسرا سینے پر رکھا تھا۔ ناک سے خون نکل رہا تھا۔ وہ کسی کو کچھ نہ بتا سکا۔ صحن میں آکر گر ااور مر گیا۔

عائشہ نے کہا۔ ”جب وہ گرا تو مجھے فوراً رحمت کی بات یاد آئی کہ میں قدیر کو راستے سے ہٹاؤں گا۔ اُس وقت مجھے سمجھ آئی کہ اس نے کیا کہا تھا۔ قدیر کو دیکھ کر میرے منہ سے نکلا ہائے اسے تو کسی نے ذہر دے دیا ہے۔ مجھے دو آدمیوں پر بھی شک تھا۔ وہ مجھے دس دس روپے کے نوٹ دکھاتے رہتے تھے۔ مجھے پیغام بھی بھیجا کرتے تھے۔ نیتیں کرتے اور ساری عمر غلام رہنے کے وعدے کرتے تھے۔ میں جانتی ہوں کہ قدیر کی موت پر یہ سارے آدمی خوش ہوں گے۔ رحمت بھی آیا تھا۔ میں نے اسے مردوں میں بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ قدیر مجھے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن وہ میرا خاندن تھا۔ میرے سر کی پیادہ تھا۔ میری عزت اسی سے تھی۔ میں غصے سے پاگل ہونے لگی۔ رحمت دیر تک باہر مردوں میں بیٹھا رہا۔ میں اسے بار بار دیکھتی رہی۔ وہ جانے کے لیے اٹھا تو میں چوری چھپے گاؤں سے نکل کر اس کے راستے میں کھڑی ہو گئی۔ میں معلوم کرنا چاہتی تھی کہ قدیر کو نہ ہراس نے دیا ہے یا کسی اور نے۔ وہ مجھے اتنی خوشی سے ملا جیسے ہمارا رشتہ طے ہو گیا ہو۔ بڑے فخر سے کہنے لگا۔ میں نے راستہ صاف کر دیا ہے۔ تیار رہو۔ میں نے اسے کہا۔ کل ملنا۔ میں آؤں گی۔ اور وہ غم غم خوش چلا گیا۔“

میں اپنے ماں باپ کو راضی کروں گی۔ رحمت کے ماں باپ راضی نہ ہوئے تو عائشہ نے اپنی ماں سے بات تک نہ کی کہ وہ رحمت کو پسند کرتی ہے۔ اس کی شادی قدیر کے ساتھ ہوگئی۔

”قدیر کے ساتھ شادی کر کے میرا دل نرمی ہو گیا۔“ عائشہ نے مجھے سنایا۔ لیکن میں نے باپ کی پگڑی کو داغ نہ لگنے دیا۔ اُفت تک نہ کی۔ لوکیاں ڈولی میں بیٹھ کر روتی ہیں۔ میں روتی بھی نہیں۔ جب سسرال سے واپس آئی تو سہیلیوں نے مجھ سے مذاق کیے تھے کہ قدیر تجھے اتنا اچھا لگتا تھا کہ میکہ گھر اور گاؤں چھوڑتے تیری آنکھ میں آنسو بھی نہ آیا۔ میں ہنستی رہی مگر میرے دل کے زخموں کو نہ کوئی دیکھ سکا نہ میں نے کسی کو دکھایا۔ مجھے قدیر اچھا نہیں لگتا تھا۔ مجھے صرف رحمت اچھا لگتا تھا۔ شادی سے دو روز پہلے رحمت نے مجھے کہا تھا کہ اپنی کوئی لسانی دے جاؤ۔ میں نے پوچھا کہ اسے کیا پسند ہے۔ اس نے کہا کہ سر کے بال دے جاؤ۔ میں نے اپنے سر کے مقوڑے سے بال ریشمی رومال میں پیٹ کر دے دیئے۔ میں نے قدیر کو کبھی پتہ نہ چلنے دیا کہ میں اسے پسند نہیں کرتی۔ میں نے اسے کبھی پریشان نہیں کیا تھا۔ کبھی لڑی جھگڑی نہیں تھی۔ یہ اس کا باپ اور بہن باہر بیٹھے ہیں ان سے پوچھ لو۔ میرے ساتھ شادی کر کے قدیر نے کوئی قصور تو نہیں کیا تھا۔ میں اسے یا اس کے باپ اور بہن کو کیوں پریشان کرتی؟

ان لوگوں نے اپنا گھر عائشہ کے حوالے کر دیا تھا اور گھر کی مختار رہی تھی۔ اس دوران وہ میکے جاتی تو رحمت کے گھر ضرور جاتی۔ سارا سارا دن وہاں رہتی اور کبھی کبھی رحمت سے اکیلے بھی ملتی۔ رحمت اسے بار بار کہتا کہ پلو جھاگ چلیں لیکن عائشہ نہ مانی۔ اس نے رحمت سے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر تمہارے ماں باپ مان جاتے ہیں تو قدیر سے طلاق لے لیتی ہوں۔ رحمت نے اپنا وعدہ نبھایا۔ اس نے دور شتہ ٹھکرا دیئے۔ وقت گزرتے گزرتے

ریل کی لائن بہت دور نہیں تھی۔ میں نے لاش ایک لائن پر لٹادی۔ آدھا دھڑا دھڑا
آدھا آدھڑا۔ اور وہاں سے قدیر کی قبر پر چلی گئی۔ قبر پر ہاتھ پھرتی رہی اور بین کرتی رہی۔
گاؤں کے دو آدمیوں نے میری آواز سنی تو آکر مجھے گھر لے گئے۔“

میں قانون کا غلام وہ دوسرے قتل کی مجرم

عائشہ کو چند اور آدمی بھی بچانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ وہ سب کو
نفرت سے دھتکار چکی تھی۔ اس کا خاوند مارا گیا اور جسے وہ چاہتی تھی اسے اس نے
اپنے ہاتھوں مار دیا تو اس کی دماغی حالت اس کے قابو سے باہر ہونے لگی۔ اس سے پہلے
وہ دوسرے شاہ کے گھر سلام کے لیے گئی تھی۔ اب وہ بہت پریشان ہوئی تو پھر شاہ کے
پاس گئی اور اسے کہا کہ وہ اس کے لیے دعا کرے کہ خدا اس کی مشکلیں آسان کر دے۔
اسی روز وہ شاہ کے گھر سے واپس آئی تو شاہ کا بیٹا اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اس کا
خیال تھا کہ عائشہ بھی دیہات کی دوسری عورتوں کی طرح اس کا احترام کرے گی اور وہ
جو چاہے گا وہ کرے گی۔ عائشہ نے اسے بھی کھری کھری سنا دیں۔ وہ دوسرے دن پھر
شاہ کے پاس گئی تو شاہ نے اسے رات کو بلایا اور کہا کہ وہ جو تعزید دے گا وہ رات کو
لکھا جاتا ہے۔ عائشہ جھانسنے میں لگی۔ اگر وہ شام تک رات کو پہنچ جاتی تو شاہ نہیں
تھا یا عائشہ کی عزت نہیں تھی۔ ہوا یوں کہ شاہ کا بیٹا بھی سن رہا تھا کہ عائشہ کو باپ نے
رات کو بلایا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب عائشہ رات کے وقت شاہ کے گھر کی طرف جا
رہی تھی اس کا بیٹا اسے راستے میں مل گیا۔ اس نے اس پر اپنی خبیث نیت کا اظہار کیا۔

عائشہ کے دل میں انتقام لگ گیا۔ وہ دو روز بعد رات گاؤں سے دُور اُس جگہ پہنچی جو
اُس نے رحمت کو بتائی تھی۔ رحمت اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے جو افراد کی طرح گردن
تان کر اسے کہا۔ ”میں قدیر جیسے دس آدمیوں کو ختم کر سکتا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی
اس پر شیطان سوار ہو گیا۔ وہ عائشہ کو کھڑی فصل میں چلنے کو کہنے لگا۔

عائشہ نے مجھے سنایا۔ ”میں بدکار نہیں۔ میں نے اسے کہا تھا کہ جائز طریقے
سے شادی کرو۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں خاوند سے طلاق لے لیتی ہوں لیکن اس نے
میرے خاوند کو زہر دے دیا اور ابھی اس کی قبر کی مٹی خشک نہیں ہوئی تھی کہ مجھے بدکاری
کے لیے کہنے لگا۔ میں بھول گئی کہ اس شخص کو میری روح بھی چاہتی ہے۔ میں نے یہی
محسوس کیا کہ وہ مجھے بیوہ سمجھ کر مجھے فصل کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔ میں نے اس کے پیچھے
ہنر کر اس کی گردن ہاتھوں میں دبائی۔ اُس نے زور لگایا لیکن میں نے اس کا سانس روک
دیا۔ وہ بے بس ہو کر تڑپنے لگا اور گر پڑا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہی گئی۔ گردن نہ چھوڑی۔
میرے منہ سے یہی لفظ بار بار نکلتے تھے۔ تم مرد ہوتے تو بزدل چوروں کی طرح میرے
خاوند کو زہر نہ دیتے۔ میں اپنے خاوند کا پورا بدلہ لوں گی۔ پھر اس کی حرکت ختم ہو گئی۔“

وہ بول رہی تھی اور میں اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی روح کا حُسن
اس کے چہرے پر اُگیا تھا۔ اور اب کسی ڈر یا خطرے کے بغیر بول رہی تھی۔ اُس نے کہا۔
”میں نہیں بتا سکتی کہ میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی اور میری عقل پر کس
شریزار کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اس کی زبان نکل گئی تو مجھے کوئی اندس نہیں ہوا اور نہ مجھے ڈر
لگا کہ کپڑی جاؤں گی۔ میں اور زیادہ دلیر ہو گئی۔ میں نے لاش کو کندھے پر ڈال لیا۔ آپ
نہیں مانیں گے کہ میں نے اتنے بھاری مرد کو کندھے پر اٹھالیا ہوگا۔ میں نے اسے اٹھالیا

میں وہ کیا کشش ہے جس نے میری تخانیداری کو بھی ہلا دیا تھا۔ یہ روح کا ضمن تھا اور یہ دل کی پاکیزگی تھی جو اس کی آنکھوں میں چمکتی تھی اور جو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر کھلی رہتی تھی۔ مجھ میں اتنی جرات نہیں تھی کہ احترام سے اس کے سر کو چوموں جیسے پاک رکھنے کے لیے اس نے دو مردوں کی گردنیں مروڑ دی تھیں۔

میں جب تھانے گیا تو میں نے اس کے اُن بالوں کو چومنا جو شاہ کے بیٹے کی مٹھی سے نکالے تھے اور انہیں بھی جو رحمت کی لاش کی جینب سے برآمد ہوئے تھے، مگر عاشر نے مجھے بڑے ہی سخت امتحان میں ڈال دیا۔ قانون کی نگاہ میں وہ دوہرے قتل کی مجرم تھی لیکن میری نگاہ میں اس کا رتبہ کچھ اور تھا۔ میں قانون کا غلام تھا۔ تین آدمی قتل ہو گئے تھے۔ مجھے استغاثہ مضبوط بنانا تھا مگر میرے اندر اس لڑکی کا ایک مسلمان بھائی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی کو سزا ہو۔ مجھے لڑکی کو حراست میں ضرور لینا تھا اور مجسٹریٹ کے پاس لے جا کر اقبالی بیان بھی ریکارڈ کرانا تھا۔

میں عاشر کو حراست میں لے کر تھانے لے گیا۔ اسے حالات میں بند کر دیا اور کانٹیلوں سے کہا کہ اسے معمولی سی ملزم نہ سمجھیں۔ اسے عورت سے رکھیں۔ اس کے لیے کھانا اپنے گھر سے پکوا کر بھیجا۔ سوچ سوچ کر میرا سر چکرانے لگا۔ شام کو ایک گاڑی ہمارے سٹیٹن پر کتی تھی۔ مجھے ایک سکھ مجسٹریٹ کا خیال آیا۔ میں نے ایک بار اس کا ایک کام کیا تھا۔ میں نے وردی اتاری۔ اپنے کپڑے پہنے اور شام کی گاڑی سے شہر چلا گیا۔ آدھے گھنٹے کا سفر تھا۔ شہر پہنچا تو اس سکھ مجسٹریٹ کے گھر چلا گیا۔ ہندو بڑی ہی کینی اور دھوکا باز قوم ہے۔ سکھوں پر بھروسہ کیا جاسکتا تھا۔ مجسٹریٹ گھر پر مل گیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ میں نے اسے عاشر کی ساری کہانی اور اس کا بیان سنا دیا اور اسے کہا کہ میں

عاشر نے اسے سختی سے منگ کیا تو شاہ کا بیٹا اپنی مردانگی کا رعب جمانے لگا۔

عاشر نے اس کے منہ پر پتھر مارا۔ شاہ کے بیٹے نے ایک ہاتھ عاشر کے دائیں کان پر رکھا، دوسرا بائیں کان پر اور اس طرح اس کے سر کو جکڑ کر اپنا منہ اس کے منہ کی طرف لے جانے لگا۔ عاشر نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کپڑی اور دونوں انگوٹھے شاہ رگ کے دائیں بائیں رکھ کر پورے زور سے دبائے۔ شاہ نے عاشر کے بال مٹھیوں میں پکڑ کر کھینچے اور اس کے ہاتھوں میں اس کا ایک کانٹا بھی آگیا ہوگا جس کا ایک موٹی نکل کر گر پڑا۔ عاشر نے اس کی گردن کو اور زیادہ دبا یا۔ شاہ کا بیٹا بہت تڑپا لیکن عاشر اپنی عزت کی خاطر چوڑیل بن چکی تھی۔ اس نے اسے جہاں سے مارا ہی دم لیا۔ وہ گرا تو عاشر کے کئی بال اس کی مٹھیوں میں چلے گئے۔ عاشر شاہ کے گھر نہ گئی۔ وہیں سے واپس آگئی۔

میں اس کے گھر اس لیے نہ گئی کہ مجھے اس کی بھی نیت پر شک ہو گیا تھا۔ عاشر نے کہا۔ ”معلوم نہیں مجھے یہ عقل کس نے دی کہ شاہ جو تعویذات کو دے گا وہ دن کے وقت بھی دے سکتا ہے۔ مجھے اس کی آنکھیں یاد آگئیں۔ میں اس کے پاس جاتی تھی تو مجھے باؤ لے کتوں کی طرح دیکھتا تھا۔“

عاشر نے کہا۔ ”اس سے پہلے بھی کئی مرد میرے پیچھے پڑے رہتے تھے۔ لیکن میں نے کبھی پروا نہیں کی تھی۔ مگر میرا خاندان بار آگیا تو میں چوڑیل بن گئی۔ میں اپنے خاندان سے شرسا رہوں کہ اس کی زندگی میں ایک غیر مرد کو دل میں بیٹھائے رکھا لیکن میرا خدا خود ہی گواہی دے گا کہ میرے اس جسم کا مالک میرا خدا نہ تھا۔ یہ جسم اُسے بھی نہیں دیا جسے میں دل سے چاہتی تھی۔“

اُس وقت عاشر کا ضمن دیکھنے والا تھا۔ مجھے اس سوال کا جواب مل گیا کہ اس لڑکی

اسے آپ کے پاس اقبال جرم کے لیے لا رہا ہوں مگر میں چاہتا ہوں کہ وہ سزا سے بچ جائے۔
کچھ سمجھ گیا کہ میری نیت خراب نہیں اور میں روٹی کی غیرت مندی کی وجہ سے اسے بچانا
چاہتا ہوں۔ اس کا طریقہ یہی تھا کہ کچھ گڑ بڑ اقبالی بیان میں یہ مجسٹریٹ کر دے اور استغاثہ
میں ایک دو کمر دریاں میں خود چھوڑ دوں۔

جن بہنوں کے بھائی نہیں ہوتے،

میں نے مجسٹریٹ سے کہا: "میں چاہتا ہوں کہ آپ اقبالی بیان اتنا کمزور لکھیں کہ پھر
کسی کو شک نہ ہو اور عدالت یہ ریماڈک نہ دے دے کہ پولیس نے استغاثہ بہت کمزور بنایا ہے۔"
مجسٹریٹ میری بات سمجھ گیا۔ اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ میرا کام کر دے گا اور روٹی کی
بری ہونے کا موقع دے گا۔ رات کی پندرہ گھنٹوں سے میں واپس آیا۔ میں نے عائشہ سے کچھ بھی
نہ کہا۔ مجھے وہ رات آج بھی یاد ہے۔ میں ساری رات نہ سویا۔ سوچتا رہا کہ روٹی میں بدلتا
رہا اور صبح ہو گئی۔ عائشہ کو حملات سے نکالا۔ اسے ناشتہ کروایا۔ منہ ہاتھ دھلایا اور
ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر عائشہ کو ریوے سیشن پر لے گیا۔ یہ گاڑی بھی ہمارے سیشن پر
رکتی تھی۔

میں نے اُسے کہا: "پہلے مجھے لڑکی دکھا دو۔
ہو سکتا ہے یہ وہ لڑکی نہ ہو جسے میں ڈھونڈ رہا
ہوں۔"

اُس نے جواب دیا: "یہ وہی لڑکی ہے
جس نے کوٹھی میں ایک شہری بد معاش کو
قتل کیا ہے۔ یہ لڑکی جوان، خوبصورت اور
کنواری ہے۔"

میں عائشہ کو مجسٹریٹ کے پاس اقبالی بیان کے لیے لے گیا۔ مجسٹریٹ نے اپنا وعدہ
پورا کر دیا۔ کچھ کمر دریاں اقبالی بیان میں ڈال دیں۔ کچھ گڑ بڑ میں نے اپنے استغاثہ میں
کی لیکن ہم دونوں عائشہ کو عمر قید سے نہ بچا سکے اور وہ اپیل میں بھی بری نہ ہو سکی۔ اس کی
ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ عائشہ سیشن کورٹ میں جا کر بھی اپنے اقبالی بیان سے منحرف
نہیں ہوئی تھی۔

ان کی توہین کا باعث نہیں بننا چاہتا۔

شہر سے ذرا باہر کھلے علاقے میں ایک سکھ تاجر نے کوٹھی بنوائی جو ابھی غیر آباد تھی۔ اس کے سامنے ابھی ریت، سینٹ اور مٹی وغیرہ بکھری ہوئی تھی۔ ایک صبح اطلاع ملی کہ اس کوٹھی کے برآمدے میں ایک لاش پڑی ہے۔ میں ضروری عملے کو ساتھ لے کر پہنچا۔ بڑا اچھا اتفاق تھا کہ گشت والا کانسٹیبل کہیں قریب تھا۔ اس نے عقلمندی کی کہ کوٹھی کے دونوں پھاٹک بند کر دیئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو تماشائی اندر جا کر کھرے رپاؤں کے نشان، تباہ کھڑیئے۔ اس طرح سراسر سانی میں بہت دشواری پیدا ہو جاتی۔

میں پھاٹک میں داخل ہوا تو ریت، سینٹ اور مٹی پر کھرے واضح تھے۔ کھوجی بلوایا اور خود اندر گھروں سے پتلا اندر گیا۔ لاش دروازے میں پڑی تھی۔ سر سے کھوجی برآمدے میں اور ٹانگیں کمرے میں۔ خون بہ کر برآمدے سے بھی باہر چلا گیا تھا۔ یہ پینتیس سال کے لگ بھگ عمر کا ایک مسلمان تھا۔ خاصا خوب رو آدمی تھا۔ کمرے میں لاش کے پاؤں کے قریب ایک چھری پڑی تھی جو قصاب استعمال کرتے ہیں اور گھروں میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس چھری کے دو نغم لاش کے پیٹ میں تھے اور ایک سینے میں۔ لاش کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر چھری کا گہرا گٹ تھا جو ظاہر کرتا تھا کہ مقتول کے پیٹ میں چھری گئی تو اس نے چھری پکڑی۔ قابل نے چھری کھینچی تو مقتول کا ہاتھ کٹ گیا۔

کھوجی کے آنے تک میں نے گھروں کی طرف توجہ نہ دی۔ جاہے واردات کو غور سے دیکھنے لگا۔ شاید سراسر سانی میں مدد کرنے والی کوئی چیز مل جائے۔ کمرے میں فرش پر کاپڑ کی دو چوڑیوں کے ٹکڑے ملے۔ جن دروازے میں لاش پڑی تھی اس کے ایک کواڑ کے پچھلی طرف ایک کیل گاڑی گئی تھی، وہ کوئی دو تین سوڑے ساٹنے سے باہر نکلی ہوئی

میں نے پچھلی کسی کہانی میں آپ کو بتایا تھا کہ پولیس کا ریکارڈ دیکھیں تو آپ کو کئی ایک ناقابل یقین اور ان ہونے واقعات نظر آئیں گے جیسے پولیس کے کسی زرنیزر داغ تھا نیدار نے کہانیاں گھڑ لی ہوں یا کوئی آفسانہ نویس الفٹ لیلے کی نقل ماہر بنا ہوا ہو۔ لیکن پولیس والوں کے لیے کوئی واردات حیران کن نہیں ہوتی۔ انسانی فطرت بڑا ہی گہرا اور بہت ہی وسیع سمندر ہے۔ اس سمندر میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے؟ یہ آپ کو عام نفسیات کا کوئی تجربہ کار ڈاکٹر بتا سکتا ہے یا وہ پولیس انسپکٹر جو تفتیش میں دیانت دار، محنتی اور مخلص ہو۔

یہ واردات جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں ایسی ہی وارداتوں میں سے ایک ہے جو ہر اس شہری کے لیے اگر ناقابل یقین نہیں تو حیران کن ضرور ہوگی جو انسانی فطرت کو نہیں سمجھتا۔ میری کہانیاں پڑھتے وقت یہ خاص طور پر پیش نظر رکھیں کہ میں واردات کے شہروں، قصبوں، دیہات اور کرداروں کے نام نہیں لکھا کرتا۔ کبھی سہولت کے لیے کرداروں کے جو نام لکھتا ہوں وہ صحیح نہیں ہوتے۔ اس احتیاط کی وجہ یہ ہے کہ متعدد متعلقہ خاندان ہجرت کر کے پاکستان میں آگئے تھے اور یہاں باعزت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں

جادوگر لگتا تھا۔ بعض اوقات ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے بچپن میں جو کھرے اپنے باپ کے ساتھ دیکھے تھے وہ ابھی تک اسے یاد ہیں۔ اُس نے کوٹھی کے دونوں پھاٹکوں سے باری باری کوٹھی کے برآمدے تک زمین دیکھی۔ پھر متول کی بھوتی کا تلوا دیکھا اور ہر ایک گھرا بچھے دکھا کہ جن میں سے بعض نظر بھی نہیں آتے تھے، تشریح کی کہ مقتول اس پھاٹک سے اندر گیا۔ عورت اس کے بعد یا اس کے پیچھے پیچھے اسی پھاٹک سے اندر گئی۔ یہ دیکھنے، کھرے پر کھڑا چڑھا ہوا ہے۔ مقتول باہر نہیں نکل سکا۔ کھرے میں قتل ہوا اور دروازے میں گرا۔ پھر دو آدمی دوسرے پھاٹک میں سے اندر گئے۔ عورت برآمدے میں تھی یا کھرے میں۔ پھر یہ عورت ان دو آدمیوں کے ساتھ چلی گئی۔

کھوجی نے واپسی کے کھرے مجھے دکھا کر کہا۔ یہ دو آدمی برآمدے کی طرف منہ کر کے کھرے ہیں۔ یہ دیکھئے۔ عورت برآمدے سے کچے پر آئی ہے۔ اب ایک آدمی اس کے دائیں ہے اور دوسرا بائیں۔ عورت اپنی مرضی سے جا رہی ہے۔ اسے کوئی گھسیٹ نہیں رہا۔ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ عورت دانے کے طور پر استعمال کی گئی ہے۔ یہ دو آدمی مقتول کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اسے یہاں لانے کے لیے انہوں نے اسے اس عورت سے پھانسا ہے۔ وہ عورت کے جھانسنے میں آگیا اور دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

عورت کی مرضی کچھ اور تھی

لیکن میرا مسئلہ تو یہ تھا کہ یہ دو آدمی کون تھے اور یہ عورت کون تھی؟ قتل کا باعث

تھی۔ اس کے ساتھ باریک سے کپڑے کا ذرا عتنا لکڑا اٹکا ہوا تھا۔ یہ مثل نلک نصفت اچھ ہوگا۔ میں نے یہ لکڑا کیل سے اتارا اور غور سے دیکھا۔ یہ کسی عورت کے دوپٹے کا تھا جو صاف ظاہر کرتا تھا کہ کوئی عورت اندر سے نکلی تو اس کا دوپٹہ جو محل اور میٹم سے زیادہ باریک تھا اس کیل میں پھنس گیا۔ عورت نے جلدی میں کھینچا اور یہ لکڑا ابھیں رہ گیا۔ چوڑیوں کے ٹکڑوں اور دوپٹے کے اس چھوٹے سے ٹکڑے نے یہ وضاحت کر دی کہ مقتول کے ساتھ ایک عورت تھی۔

دو ہی باتیں ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ مقتول اس غیر آباد کوٹھی میں اس عورت کو زبردستی بے آبرو کرنے کے لیے لایا تھا اور عورت کے لواحقین بروقت پہنچ گئے یا مقتول کے ساتھ کوئی اور آدمی تھا جس کا مقتول کے ساتھ اس عورت پر جھگڑا ہو گیا ہوگا۔ جنسی جرائم کے مجرم درندے ہوا کرتے ہیں۔ ایسے مجرموں کے درمیان ایک عورت آجائے تو ان کی حالت کتوں جیسی ہو جاتی ہے۔ کچھ رنگ ہوا کہ یہ واردات اسی نوعیت کی ہے۔

کھوجی بہت دیر سے آیا۔ میں نے اس دوران لاش کی برآمدگی، اسے اپنے قبضے میں کرنے اور پرمٹارٹم کے لیے بھیجنے کی کاغذی کارروائی مکمل کر لی۔ جن دو آدمیوں کے میں نے بطور گواہ دستخط لیے ان میں سے ایک نے مقتول کو پہچان لیا۔ مقتول کا انداز تھا۔ اس کی چوڑیوں، سرخی ٹوڈر، لپ سٹک وغیرہ اور عورتوں کے بناؤ سنگار اور دیگر زنانہ ضروریات کی دکان تھی۔ شکل و صورت سے وہ معمولی قسم کا دکاندار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے گھر کا پتہ بھی مل گیا۔

اتنے میں کھوجی آگیا۔ وہ کم و بیش ساٹھ سال کی عمر کا آدمی تھا۔ اپنے فن میں

بیان کر دیا کرتے ہیں لیکن یہ بانی سنانے کے لیے ماہر کھوجی کی ضرورت ہوتی ہے میں آپ کو تفصیلات نہیں سنا سکتا کیونکہ یہ بہت لمبی ہیں۔ آپ بور ہو جائیں گے۔ اگر آپ کسی کھوجی کے ساتھ کھرا اٹھاتے ہوئے چلیں تو وہ اس طرح کھڑے بیان کرتا جائے گا جیسے وہ ملزموں کی حرکات اور چال دیکھ رہا ہے اور آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہے۔ کھوجی مجھے بتا رہا تھا کہ عورت کو زبردستی سے جایا جا رہا ہے۔ مجھے کچھ بچھے بچھے ادھورے ادھورے اور کچھ نمایاں کھڑے نظر آ رہے تھے۔

ہم اور دُور نکل گئے۔ کھڑے ہمیں عام راستے سے ہٹا کر ویران علاقے میں لے گئے تھے۔ میں نے ایک جگہ رک کر آگے دیکھا تو تقریباً پچاس قدم دُور ایک جھاڑی کے ساتھ اُٹھا ہوا کپڑا مجھے نظر آیا۔ میں دُور کر دیاں پہنچا۔ کانٹوں والی ایک جھاڑی کے ساتھ جا رہا تھا ایک دوپٹہ اُلجھا ہوا تھا۔ اس پر خون کے دھبے تھے اور من میں بھینکا ہوا پورا ہاتھ لگا ہوا تھا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ مقتول نے اپنا یہ ہاتھ پیٹ کے زخم پر رکھا پھر عورت کو پٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھ عورت کی پیٹیٹ پر پڑا۔ خون آلود ہاتھ کا پورا نشان دوپٹے پر لگا اور عورت بھاگ گئی۔

اس دوپٹے کا رنگ فیروزہ تھا۔ میں نے جیب سے معذور سا ٹکڑا نکالا جو دروازے سے نکلی ہوئی کیل کے ساتھ اٹکا ہوا تھا۔ دوپٹے سے ملایا۔ یہ اسی دوپٹے کا ٹکڑا تھا۔ میں نے دوپٹے کو دیکھا۔ ایک جگہ سے ٹکڑا غائب تھا اور دھاگے کپھے ہوئے تھے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ یہ دوپٹہ اسی عورت کا ہے جو غیر آباد کوٹھی میں مقتول کے ساتھ تھی۔

باقی کہانی کھوجی نے بیان کر دی۔ اُس نے زمین پر جھک کر دیکھا۔ ایک تو اُس نے ایک چوڑی کے تین ٹکڑے اٹھا کے مجھے دیئے۔ میں نے انہیں ملایا تو پوری چوڑی بن گئی۔ اس

اور طریقہ معلوم کر لینا ہی کافی نہیں تھا۔ لاش پوہٹ مارٹم کے لیے مجھوادی اور میں کھوجی کو ساتھ لے کر پڑھنے کے لیے باہر نکلا کہ یہ دو آدمی اور عورت کس طرف گئے ہیں تپانسیوں کو ہم نے کوٹھی کے قریب نہیں آئے دیا تھا۔ ارد گرد کا علاقہ کچا تھا۔ کوٹھی کے قریب سے ایک سڑک گزرتی تھی جو شہر میں جاتی تھی۔ کچا علاقہ کھرا اٹھانے کے لیے بہت اچھا تھا۔ پہلے تو کھوجی سڑک کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف زمین دیکھتا گیا مگر تھوڑی دُور سے واپس آ گیا۔ اُس زمانے میں ٹریفک کا یہ حال نہیں تھا۔ لوگوں کے پاس اتنی زیادہ کاریں، بسیں اور سکوٹر وغیرہ نہیں تھے۔ کوٹھی کے پھاٹک پر آکر اُس نے کھڑوں کے رخ دیکھے تو غیر آباد علاقے کی طرف چل پڑا۔ ڈیڑھ سو گز آگے جا کر سڑک ایک طرف مڑ جاتی تھی۔ وہاں سے اُس نے مجھے آواز دی۔ میں گیا تو اُس نے کہا۔ ”آپ کی تفتیش شہر سے نکل گئی ہے۔“ اُس نے زمین پر چھوٹی کاسرا رکھ کر کہا۔ ”یہ جا رہے ہیں آپ کے ملزم۔“ میں نے اس کی ہاں میں ہاں تو ملا دی لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے زمین پر کچھ نظر نہیں آیا۔

وہ مجھے آگے لے گیا۔ یہ علاقہ ویران اور بخر تھا۔ کچی مٹی، کہیں پتھر کی طرح سخت، کانٹوں والی جھاڑیاں، درخت وغیرہ۔ زیر کاشت کھیت دُور آگے سے شروع ہوتے تھے۔ ہم کوئی بیس قدم آگے گئے تو کھوجی ایک جگہ رک کر جھک گیا۔ کہنے لگا۔ ”عورت اپنی مرضی سے نہیں جا رہی۔ دُور عورت سے دیکھیں، وہ یہاں تک گئی ہے۔ آدمی اسے کچن رہے ہیں۔ یہ کھڑے اس کی مرضی کے نہیں۔“

میں نے دیکھا۔ کھڑے گڈ بٹھے۔ زمانہ پاؤں بے قائمہ تھے۔ کھوجی باگے چلتا گیا اور بار بار کہتا رہا۔ ”ملک صاحب! معاملہ کڑ بڑ ہے۔ عورت کی مرضی کچھ اور ہے۔“

یہاں میں آپ کو یہ بتا دوں کہ ملزموں کے کھڑے بعض اوقات واردات کی کہانی

کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ یہ واردات رہزنی کی بھی نہیں تھی کیونکہ مقتول کی جیب سے ایک چھتیس روپے برآمد ہوئے تھے۔ گھڑی اور سونے کی ایک انگوٹھی اس کے جسم کے ساتھ تھی۔ یہی کچھ سوچتا ہوا میں آگے بڑھتا گیا۔ کچھ دُور بے شمار گرد اڑتی نظر آئی۔ کھڑوں کا معلقہ چوہا پتہ دکھائی دیا۔ مویشیوں کا بہت بڑا ریڑ بھیل ہوا آ رہا تھا۔ یہ مویشیوں کی خرید و فروخت کرنے والے لوگ تھے۔ وہ سوڈ ریڈھ سو بھینس لگائیں اور بیل ساتھ لیے نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔ ایسا ہی ایک ریوڑ چلا آ رہا تھا۔ رخ ہماری طرف تھا۔ روکنا ممکن نہیں تھا۔ کم و بیش ایک سو مویشی ہمارے قریب آ گئے اور دو دو ٹرک پھیلے ہوئے گزر گئے۔

ہم ان کے درمیان کھڑے رہے۔ بہت گرد اڑ رہی تھی۔ ریوڑ گزر گیا تو چھ سات آدمی اس کے پیچھے نظر آئے۔ مجھے وہ بھی میں دیکھ کر گھبرا گئے۔ ان میں ایک نے ایک سینڈل اٹھا رکھی تھی جو اس نے پچھلے سڑیپ سے پکڑ کر ایک بھینس کو ماری۔ کھوجی نے اسے بلایا اور پھینڈل اس کے ہاتھ سے لے کر تلوا دیکھا۔ میں نے بھی دیکھا کہ یہ شہری قسم کی سینڈل تھی جو اس قسم کے آدمی کے پاس نہیں ہونی چاہیے تھی۔ یہ ایک ہی پاؤں تھا۔ اس نے ہمارے پچھے بیڑ کہا۔ ”جنور، یہ پاؤں وہاں پڑا تھا۔“ اس نے پیچھے کو اشارہ کیا۔ میں اسے اس جگہ تک ساتھ لے گیا۔ وہ جگہ کوئی تین فرلانگ دُور تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ پاؤں پہلی پڑا تھا۔ اُس نے اٹھا لیا۔ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ اس پر کسی قسم کا تشک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ البتہ ان لوگوں پر مجھے غصہ بہت آیا کیونکہ انہوں نے کھڑے تباہ کر دیئے تھے۔ البتہ قاتل یا مغویہ کی ایک نشانی مجھے دے گئے۔ میں نے سینڈل کا یہ پاؤں اپنے پاس رکھ لیا۔

میں وہیں رُک گیا۔ آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں سوچنے لگا۔ ایک صورت

چوڑی کارنگ اور ڈیزائن دہی تھا جو جانے واردات سے برآمد ہونے والی چوڑیوں کا تھا۔ وہاں کھڑے بڑی طرح گڈ بڑھے۔ کھوجی نے بہت غور سے کھڑے دیکھے اور کہا۔ ”عورت آگے نہیں جا رہی۔ اس کے ساتھ زبردستی ہو رہی ہے۔ زبردستی گھینٹا جا رہا ہے۔ وہ واپس جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ آدمی اسے روک رہے ہیں۔ وہ بیٹھ گئی ہے۔ یہ نشان غور سے دیکھیں۔ یہ ہاتھ کا نشان ہے۔ یہاں سے جب اسے اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے اس کا دوپٹہ جھاڑی کے کانٹوں نے پکڑ لیا ہے۔“

کھوجی اٹھ کر آگے گیا۔ زمین پر جھک کر چلتے ہیں پچیس قدم دُور چلا گیا اور واپس آ گیا۔ پھر مجھے ساتھ لے جا کر کھڑے دکھانے لگا۔ ”اب آپ کو عورت کا کھڑا نظر نہیں آئے گا کیونکہ ان میں سے ایک آدمی نے اسے اٹھا لیا ہے۔“ اس نے کھڑوں کو غور سے دیکھ کر ایک کھڑے پر چھڑی رکھی اور کہا۔ ”اس آدمی کے اوپر وزن ہے۔ آگے جا کر ایک جگہ کھڑے پوری طرح واضح ہو گئے۔ زمین بھر بھری تھی۔ میں نے فوراً ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا عملہ میرے ساتھ تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ان کھڑوں کا مولڈ فوراً تیار کرو۔ اُس نے ایک کانسٹیبل کو وہاں پہرے پر کھڑا کر دیا اور مولڈ کا انتظام کرنے چلا گیا۔

”یہ دونوں دیہاتی ہیں“ کھوجی نے کہا۔ ”دیہاتی جو تیاں پہنے ہوئے ہیں۔ عورت کے متعلق مجھے شک ہے۔“

دوپٹہ اور سینڈل

کھوجی کی یہ رائے میرے لیے حیران کن تھی کیونکہ دیہاتیوں کی کسی شہری دکھاؤ نہ

میں نے سب سے پہلے اس کی بیوی سے پوچھ گچھ کی۔ وہ روتی تھی۔ سواوں کا جواب اس انداز سے دیتی تھی جیسے اسے اس تفتیش کے ساتھ کوئی دلچسپی نہ ہو۔ میں نے پوچھا کہ مقتول کا سلوک اس کے ساتھ کیسا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ جیسا تھا، ٹھیک ہی تھا۔ اللہ اس کی قبر ٹھنڈی کرے۔“

میں نے پوچھا کہ اس کے علم میں ہے کہ اس کا کسی عورت کے ساتھ دوستانہ تھا؟ اس نے جواب دیا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔“

اُس کے اس انداز سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ خاندان کو پسند نہیں کرتی تھی۔ میں نے پوچھا کہ خاندان کے ساتھ اُس کا کبھی جھگڑا ہوا ہے؟ اُس نے کہا۔ کبھی نہیں۔“

یہ اچھی شکل و صورت کی عورت تھی۔ اس کے تین بچے تھے۔ بڑا لڑکا عمر پندرہ سال۔ ایک لڑکی عمر دس سال اور ایک لڑکا عمر دو سال۔ مجھے اس عورت پر شک ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ چھپا رہی تھی۔ میں نے اس سے اور کچھ نہ پوچھا۔ اسے پتہ نہ چلنے دیا اور اُس کے بیٹے کو میں تھانے لے گیا۔ اس کے ساتھ میں نے دوستانہ باتیں کیں اور اس کے باپ کے قتل پر افسوس کا اظہار کیا تو اس پر پولیس کا جو خوف طاری تھا وہ ختم ہو گیا۔ وہ آخر بچتھا۔ میری پیار بھری باتوں کے چکر میں آ گیا۔

اُس نے بتایا کہ اُس کا باپ اس کی ماں کے ساتھ بڑا سلوک کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کے باپ سے اکثر لڑتی تھی۔ تین پیارے ماں روٹھ کر کیے چلی گئی تھی۔ اُس کا باپ اس کی ماں کو کبھی کبھی مارتا پٹیتا بھی تھا۔ لڑکے کے دو ماموں دو تین بار اُس کے باپ سے لڑے بھی تھے۔ میں نے پوچھا کہ وہ تمہارے باپ سے لڑے کس طرح تھے؟ یعنی ہاتھ پائی ہوئی تھی یا زبان لڑائی؟ لڑائی لڑائی گالی گلوچ تک ہوتی تھی۔ ایک بار چھوٹے

یہ دماغ میں آئی کہ یہ عورت احوال کی جا رہی تھی۔ مقتول نے اسے ان آدمیوں سے چھڑانے کی کوشش کی اور مارا گیا لیکن عورت کمرے میں تھی۔ تو اس کا مطلب یہ ہو سکتا تھا کہ یہ دو آدمی اس عورت کے ساتھ غیر آباد کوٹھی میں زبردستی کر رہے تھے۔ عورت کے شوہر پر مقتول اندر گیا اور مارا گیا۔ مگر عورت کے دو پیٹے پر خون آلود ہاتھ کا نشان کیوں؟ سوچ سوچ کر میں نے کھوجی سے کہا کہ چلو تھانے چلیں۔ میرا یہ فیصلہ غلط تھا۔ مجھے اس علاقے کو اور زیادہ کھنڈنا چاہیے تھا مگر مویشیوں کے ریوڑ نے میرا دماغ خراب کر دیا۔

یہ انسانی فطرت کی کمزوریاں ہوتی ہیں جو غلط فیصلے کر دیتی ہیں۔ پولیس انسپکٹر کو بڈریو جیسے کرب دکھانے پڑتے ہیں لیکن وہ عام ذہن کا انسان ہوتا ہے۔ ذرا سی بھول چوک یا غلط خیال اس کی تفتیش کا بیڑا غرق کر دیتا ہے۔ میں تھکنے یا مارنے والا آدمی نہیں تھا مگر کوئی لڑکے ریوڑ نے میرا موڈ ایسا تباہ کیا کہ میں واپس چلا گیا۔ مجھے صرف سینڈل کا ایک پاؤں ملا ہے دیکھ کر کھوجی نے تصدیق کی کہ جو کھڑے ہم نے کوٹھی سے یہاں تک دیکھے ہیں وہ اسی سینڈل کے ہیں۔

میں تھانے میں پہنچا تو شام کے سو اچانچ رہے تھے۔ میرے اے۔ ایس۔ آئی رگوناث نے مقتول کے گھر کا آٹا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ اس کے لواحقین کو ہسپتال لے جا کر لاش کی شناخت کرائی تھی۔ میں نے مجوز کو ہدایات دے دیں جن میں سب سے زیادہ ضروری یہ تھی کہ مقتول کے متعلق جس قدر معلومات فراہم ہو سکیں کریں یعنی اس کا چال چلن، اس کی دوستیاں اور اس کی دشمنیاں اور اس کے گھر بوجھ حالات۔ چال چلن معلوم کرنا تو بہت ضروری تھا کیونکہ واردات میں ایک عورت بھی تھی۔ میرے قیاس کے مطابق مقتول، عورت کی وجہ سے یا عورت کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔

کہتا تھا کہ تھلانے میں یہ نہ بتانا کہ ہمارا مقتول کے ساتھ کوئی جھگڑا تھا اور نہ قتل میں کپڑے جاہیں گے۔ میں نہیں مانا۔ میں نے کہا کہ پولیس کو معلوم ہونا چاہیے کہ مرنے والا کس تماش کا آدمی تھا۔ اُس نے ضرور کسی کی بہو میٹھی کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہوگا اور مارا گیا۔

”کوئی ایک عورت بتا سکتے ہو جس کے ساتھ اس کے تعلقات تھے؟“ میں نے پوچھا۔

اُس نے بہت سوچا پھر کہنے لگا۔ ”اُس کا زیادہ دوستانہ ہندوؤں کی عورتوں کیساتھ

تھا۔ ایک بار دو سیکھوں نے اسے دکان میں پیٹ بھی ڈالا تھا۔ وہ دیہاتی تھے۔ ان کے ساتھ

ایک عورت بھی تھی۔ عورت اس کی دکان میں گئی اور دونوں سیکھ باہر کھڑے رہے۔ مقتول

نے نہ جانے اس عورت سے کیا کہا کہ عورت نے اسے کانیاں دینی شروع کر دیں۔ سیکھوں نے

اندر جا کر اسے خوب پیٹا۔

”کب کا واقعہ ہے؟“

”دو مہینے گزر گئے ہیں۔“

میں نے اے۔ اے۔ اے۔ آئی سے کہا کہ وہ مقتول کی دکان کے ساتھ والے دکانداروں سے

معلوم کرے کہ جن سیکھوں نے مقتول کو پیٹا تھا انہیں کوئی جانتا پچانتا ہے؟ اور کیا ان کی

نشاندہی ممکن ہے؟ میرے دماغ میں تفتیش کی یہ لائن اگنی تھی کہ مقتول عورتوں کا شکاری

تھا۔ اس کی تصدیق میرے دو مجروروں نے شام سے پہلے کر دی تھی۔ انہوں نے بھی

شکاری کا لفظ ہی استعمال کیا تھا۔ دو تین دکانداروں نے انہیں بتایا تھا کہ عورت زینا نش

اور نمائش کے سامان کی اتنی شیدائی ہوتی ہے کہ کوئی نہ کوئی عورت قیمتی اور دلکش چوڑیاں

مفت حاصل کرنے کے لیے اپنی عزت تک قربان کر دیتی ہے۔ بالکل اس طرح جس

طرح کوئی کوئی عورت ایسی نکل آتی ہے اسی طرح کوئی کوئی دکاندار بھی ایسا نکل آتا ہے

ماسوں نے ابا کو کہا تھا کہ اب ہماری بہن کو تم نے پریشان کیا تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

مقتول عورتوں کا شکاری تھا

ان دونوں آدمیوں کو تھلانے بلایا۔ پہلے بڑے بھائی کو اندر بلایا۔ اس سے میں نے

پہلا سوال یہ پوچھا۔ ”مقتول تمہارا بہنوئی تھا۔ اس کے ساتھ تمہارا کیا جھگڑا تھا؟“

”کچھ بھی نہیں جناب! اُس نے جواب دیا۔ کوئی جھگڑا نہیں تھا۔“

وہ گھرایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے اور کچھ بھی نہیں پوچھا۔ اُسے باہر بھیج کر چھوٹے

کو اندر بلایا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر چھوٹے بھائی نے بھی کہا کہ بہنوئی مقتول کے ساتھ

اُن کا کوئی جھگڑا نہیں تھا تو میں دونوں کو تھلانے میں پابند کر لوں گا۔ مگر چھوٹے بھائی کا

ردیہ مختلف تھا۔ وہ اٹھارہ انیس سال کا نوجوان تھا۔ خون میں جوش تھا۔ میں نے اس

سے پوچھا۔ ”مقتول کے ساتھ تمہارا کیا جھگڑا تھا؟“

اُس نے ہوشیارانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ عورتوں کا شکاری تھا۔ مجھے خوشی

ہے کہ وہ مارا گیا ہے۔ اگر وہ قتل نہ ہوتا تو میں خود اسے قتل کر دیتا۔ اس کی زمانہ سلمان کی

دکان ہے۔ طرح طرح کی عورتیں اس کے پاس جاتی تھیں۔ یہیں سے وہ عورتوں کا شکاری بنا

تھا۔ ہماری بہن کو گھر سے کالنا پاتا تھا۔“

”تمہارا بڑا بھائی کیوں کہتا ہے کہ مقتول کے ساتھ تمہارا کوئی جھگڑا نہیں تھا؟“ میں

نے پوچھا۔

”وہ سیدھا سادا اشرعیت آدمی ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ پولیس سے ڈرتا ہے۔ مجھے بھی

جو عورتوں کے اس شوق سے لپڑا لپڑا فائدہ اٹھاتا ہے۔ ہر عورت اور ہر دکا نڈار تو ایسا نہیں ہوتا۔ مقتول بدی کے راستے پر چل پڑا تھا۔

اے۔ ایس۔ آئی رگونا تھا دکا نڈاروں سے یہ رپورٹ لایا کہ ڈیڑھ مہینے سے کچھ دن اوپر گزرے کہ مقتول کو دو دیہاتی سکھوں نے پٹیا تھا۔ دکا نڈاروں نے یہ بھی بتایا کہ سکھ عورت نے اُسے گایاں نہیں دی تھیں۔ معاملہ کڑ بڑ تھا۔ عورت دکان میں تھی اور سکھ باہر تھے۔ معلوم نہیں وہ سکھوں کی کیا لگتی تھی۔ سکھ اندر چلے گئے اور مقتول کی اتنی پٹیاں کی کہ اگر دکا نڈار چھپرائے تھے تو وہ اسے جان سے ہی اُدھارتے۔ اس کے بعد سکھ اپنی عورت کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹ کر لے گئے۔

ایک دکا نڈار نے رگونا کو یہ بھی بتایا کہ کوئی ایک ہفتہ گزرا اس نے ایک بار پھر اس عورت کو مقتول کی دکان کے سامنے سے گزرتے دیکھا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ دکان کے اندر گئی تھی یا نہیں۔ عورت جوان اور خوبصورت تھی۔ اس دکا نڈار نے کہا کہ یہ عورت سامنے آئے تو وہ اسے پہچان سکتا ہے اور دونوں سکھوں کی شکلیں بھی اُسے یاد ہیں۔

اس رپورٹ سے میرے ذہن میں اس لائن کا آنا قدرتی تھا کہ مقتول اس سکھ کی خاطر مرا ہے۔ میں دیہاتی سکھوں کی عورتوں سے واقف تھا۔ صحیح معنوں میں شیر اور دلیر ہوتی ہیں۔

دوستی میں شیر اور دشمنی میں دلیر، دوستی یا دشمنی عورت سے ہو یا مرد سے۔ اس عورت کا مقتول کے ساتھ دوستانہ تھا۔ وہ اس کی دکان میں آتی تھی۔ یہ سکھ اُس کے بھائی بھی ہو سکتے تھے اور خاندان اور دیوبھی۔ انہوں نے ایک روز اشادہ پا کر مقتول کو دکان میں پٹیا اور اپنی عورت کو گھسیٹ کر لے گئے۔ اس سکھ نے دوستی نبھا ہی اور مقتول سے ملتی رہی۔

آخر غیر آبادی کو بٹھی میں اس کے ساتھ موقع پر کپڑی لگی۔ یہی دو سکھ اُس کے تعاقب میں

آئے ہوں گے۔ انہوں نے اُس کے آشنا کو قتل کیا اور اپنی سکھ کی کو ساتھ لے گئے۔ راستے میں وہ گھر جانے سے منکر ہو گئی۔ سکھوں نے اسے مارا پٹیا، گھسیٹا، اس کی ایک چوڑی دیاں بھی ٹوٹی اور دوپٹہ جھاڑی کے ساتھ اٹکا رہ گیا اور وہ عورت کو اٹھا کر لے گئے۔

عین ممکن تھا کہ واردات بالکل ایسے ہی ہوتی ہو جیسے میں نے سوچ تھی مگر اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ ان سکھوں اور سکھ کی کو کہاں ڈھونڈوں اور جرم کس طرح ثابت کروں۔ مجھے اپنی اس غلطی کا بھی احساس ہوا کہ میں نے کھرا آدمے راستے میں مویشیوں کے ریوڑ کی دج سے چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اگے جانا چاہیے تھا۔ شاید میں ملاموں کے گھر تک نہیں تو ان کے گاؤں تک پہنچ جاتا۔ میں نے سوچا کہ زیادہ وقت نہیں گزرا۔ اب بھی تعاقب کیا جا سکتا ہے لیکن مجھے یہ خیال بھی آ گیا کہ میرا جانا ٹھیک نہیں۔ دیہات میں تھانیدار کا جانا بہت بڑا واقعہ ہوتا تھا۔ آج کل کے تھانیداروں نے تو رشوت کے لالچ میں اپنی قدر و قیمت اور وہ رعیب ہی نہیں رہنے دیا جو ہمارے وقتوں میں تھا۔ رشوت اُس وقت بھی چلتی تھی۔ فرق یہ تھا کہ کوئی تھانیدار من سکھوں کو رشوت مانگتا نہیں تھا۔ دینے والے تھانیدار کے پاؤں میں قم رکھ جاتے تھے۔ تھانیدار اس انداز سے رشوت قبول کرتے تھے جیسے انہوں نے دینے والے پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔

میں نے یہ سوچ کر دیہاتی علاقے میں نہ جانے کا فیصلہ کر لیا کہ ملازم چوکنے ہو جائیں گے اور اپنے بچاؤ کی صورت پیدا کریں گے۔ میں نے یہ کام دیہاتی مخبروں، نمبرداروں اور چوکیداروں کے سپرد کرنے کا انتظام کر دیا۔ میں نے پولیس کے باقاعدہ اور ماہر مخبروں کو مندرجہ ذیل ہدایات دیں۔

ایسی سکھ کی نشاندہی کریں جو جوان ہے، خوبصورت ہے۔ تمیض یا شلوار یا دونوں

نہیں کیا تھا لیکن انہیں یہ تاثر نہیں دیا تھا کہ مجھے من پر شک ہے۔ یہ میرا طریقہ تفتیش تھا کہ ابتدا میں مشتبہ افراد سے واردات کے متعلق اس طرح دوستانہ باتیں کیا کرتا تھا جیسے میں جاہل اور احمق ہوں اور ان سے مشورہ لے رہا ہوں۔ بعض اوقات تو جس کے متعلق یقین ہوتا تھا کہ یہی مجرم ہے، میں اسے بھی یہی تاثر دے دیا کرتا تھا کہ مجھے اس پر ذرہ بھرتک نہیں۔ میں فوراً ہی اسے حراست میں لے کر اپنا استغاثہ کمرود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں صرف اُس وقت اُس کی گردن پر ہاتھ رکھتا تھا جب مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ اس کی گردن میرے ہاتھ سے نکل نہیں سکے گی۔

میں نے مقتول کی بیوہ اور اس کے بھائیوں کو ایسا ہی تاثر دے کر کھلی چھٹی دے دی تھی اور مجران کے پیچھے لگا دینے تھے۔ بعید از قیاس نہیں تھا کہ بیوہ کے دونوں بھائیوں نے یا چھوٹے نے اپنے کسی دوست سے مل کر مقتول سے اس طرح استقام لیا ہو۔ کہ کسی عورت کی معرفت اسے کوٹھی تک لائے اور اسے قتل کر کے عورت کو ساتھ لے گئے۔ میں انہی بھول بھلیوں میں گم تھا کہ ایک معزز مسلمان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ عمر لباس، شکل و صورت اور ذلیل ڈول سے معزز لگتا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کو کہا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کہنے لگا۔ "بات کرتے شرم آتی ہے۔ اگر آپ مسلمان نہ ہوتے تو تمھارے میں کبھی نہ آتا.... میری جوان بیٹی لاپتہ ہے۔"

اتنی سی بات سُننے ہی میرا دھیان اس عورت کی طرف گیا جو مقتول کے ساتھ غیر آباد کوٹھی میں گئی تھی لیکن میں نے جب اس شخص سے بے شمار سوال پوچھے تو مجھے مسلمان کی حیثیت سے خوشی ہوئی کہ اس لڑکی کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں مگر پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے مجھے مایوسی ہوئی۔ اس باپ نے میرے سوالوں کا

فیروزی رنگ کے ہیں اور دوپٹہ کسی اور رنگ کا فیروزی رنگ کا دوپٹہ میرے قبضے میں تھا، چوڑیاں پیاز کی رنگ کی۔ رہیں نے انہیں چوڑیوں کے ٹکڑے دکھائے۔

انہیں سینڈل کا ایک سیاہوں دکھا کر کہا کہ اس کا دوسرا پاؤں ڈھونڈیں۔ ہو سکتا ہے کسی گاؤں سے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں پھینک دیا گیا ہو۔

کسی گھر میں کسی سکھ کی بھائیوں نے یا خاندان نے مارا بیٹھا ہوگا۔

کسی گاؤں میں کوئی سکھ قتل ہوئی ہوگی اور قتل قدرتی موت کہہ کر چھپا لیا گیا ہوگا۔

میں نے ایسی ہی کچھ اور ہدایات دیں مگر میں نے کسی معجزے کی توقع نہ رکھی۔ بیشک

پولیس کے مخبر اپنے کام میں باہر تھے پھر بھی مجھے احساس تھا کہ میں نے انہیں جو کام سونپا

ہے وہ تین دنوں میں میری مرضی کے مطابق نہیں ہو سکے گا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قاتل

یہی دو سکھ ہیں اور کوٹھی میں مقتول کے ساتھ یہی سکھ ہی تھی۔ پوٹھارٹم رپورٹ میں لکھا تھا

کہ چھری کا ایک زخم جگر میں چلا گیا ہے۔ دوسرا سینے میں جس سے پھیپھڑا کٹ گیا اور تیسرا

ناف سے دو انچ دائیں اور تین انچ نیچے۔ اس سے انٹریاں کٹی ہیں اور ایک کٹ

ہتھلی پر ہے۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق موت رات کے نو اور دس بجے کے درمیان واقع

ہوتی ہے۔

لڑکی کنواری تھی

اگلے روز میں شہر میں پھیلانے ہوئے مجروں کی رپورٹیں سن کر ان کے مطابق تفتیش

کے نالے بانے سن رہا تھا۔ میں نے مقتول کی بیوہ اور اس کے بھائیوں کو بھی نظر انداز

نکر نہ کریں۔“

وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔ میں مسلمان پروری کی وجہ سے غیر مسلموں میں بدنام تھا۔ جب کوئی مسلمان، پولیس کی لپیٹ میں آجاتا تھا تو مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔ میری پوری کوشش ہوتی تھی کہ اس کی عزت کا تحفظ کروں۔ مسلمانوں کے آپس کے لڑائی جھگڑے کی میں رپورٹ رجسٹر نہیں کیا کرتا تھا۔ ان کا راضی نامہ کر کے رات چوری چھپے اُن کے گھروں میں جا کر انہیں لعن طعن کیا کرتا تھا۔ اب یہ کیس ایک مسلمان گھرانے کا آگیا جو بہت ہی نازک تھا تو میں نے ضروری سمجھا کہ رکھنا تھا کہ خبردار کروں کہ اس کیس میں وہ کوئی ہیرا پھیری نہ کرے اور رشوت کا خیال دل سے نکال دے اور لڑکی براء نہ کرے۔ اس وارننگ کے بعد میں نے اسے دیگر ہدایات دیں اور بتایا کہ یہ ضروری نہیں کہ باپ کی رائے کے مطابق لڑکی کے کسی آدمی کے ساتھ مراسم نہ ہوں۔ اکثر عیالوں ہوتا ہے کہ والدین جیسے اغوا کہتے ہیں وہ اغوا نہیں ہوتا، لڑکی اپنی مرضی سے جاتی ہے۔ اسے کوئی سوتے وقت اٹھا کر نہیں لے گیا۔ یہ شہر ہے جنگل نہیں کہ اوہرا دھر ہونی اور غائب ہوگئی۔ باپ نے کہا تھا کہ گھر میں پردے کی پابندی ہے لیکن میرے سوال کے جواب میں اس نے کہا تھا کہ اس کا برقعہ گھر میں رکھا ہے۔ مجھے کچھ تنگ پیدا ہوا۔ میں نے رکھنا تھا سب سے کہا۔ ”یہ علاقہ بیگی کا معلوم ہوتا ہے۔ بیگی کو میکڈو۔ وہ تمہاری مدد کرے گی۔“

آپ کی دلچسپی کی خاطر آپ کو بیگی کے متعلق تفصیل سے بتا دوں کہ یہ کیا چیز تھی۔ بیگی ایک اُدھیر عورت تھی جو آسمان سے تارے توڑ لاتی تھی میں نے پہلے بھی کسی کہانی میں ایسی ایک عورت کا ذکر کیا ہے۔ میں کہانی تو پرانی سنارہا ہوں لیکن بیگی جیسی عورتیں آج بھی ہمارے معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں کمال یہ ہوتا ہے کہ ہوتی بدنام ہیں لیکن شریف

جواب دیتے ہوئے بتایا کہ لڑکی کے چال چلن پر اسے کوئی شبہ نہیں۔ وہ کنواری ہے۔ کسی کے ساتھ اس کی راہ درسم نہیں۔ گھر میں پردے کی پابندی ہے۔ گھر میں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی کہ وہ ناراض ہو کر کہیں چلی گئی ہو۔ اسے لاپتہ ہوئے دو دن ہو گئے ہیں۔ شام کے بعد کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکل تھی۔

باپ نے کہا۔ ”اگر مجھے یا لڑکی کی ماں کو ذرا سا بھی شبہ ہوتا کہ لڑکی نے کسی کے ساتھ کوئی اچھا یا بُرا تعلق قائم کر رکھا ہے تو میں بتانے میں کبھی رپورٹ نہ کرتا۔ یہی سمجھتا کہ کجنت مرگئی ہے۔“

لڑکی کی طبیعت اور عادات کے متعلق باپ نے بتایا کہ طبیعت سنگفتہ ہے مگر نعتے میں آجائے تو پاگل ہو جاتی ہے اور گھروں کو بھی پاگل کر دیتی ہے۔ اس کا غصہ بلا جبر نہیں ہوتا۔ گھر میں پوری دلچسپی لیتی ہے۔ ماں باپ کا احترام کرتی ہے مگر غلطی ماں کرے یا باپ، وہ کسی کو خشتی نہیں۔ میرے کچھ اور سوالوں کا جواب دیتے ہوئے باپ نے بتایا کہ لڑکی کو بناؤ سنگھار کی عادت نہیں۔ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی بھی نہیں۔

یہ تو باپ کی رائے تھی۔ پولیس کی رائے والدین کی رائے سے بہت مختلف ہونا کرتی ہے۔ میرے ذہن پر قتل کی واردات سوار تھی۔ میں نے رپورٹ درج کر کے اپنے اسے ایس آئی رکھونا تھا کہ بلایا اور یہ کیس اس کے حوالے کر دیا۔ میں نے لڑکی کے باپ کو باہر بھیج کر رکھونا تھا سے کہا۔ ”تم ناراضی نہیں ہو رکھونا تھا میں تم سے صرف یہ سوال پوچھوں گا کہ مجھے اچھی طرح جانتے ہونا؟“

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا لیکن مجھے دیکھ کر اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ بیچر دلانہ لہجے میں بولا۔ ”ماں ملک صاحب! میں آپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کوئی

یہ مجبزی کرتے اسے ساڑھے تین سال ہو گئے تھے۔ خوب دعوورت تھی۔ اس عمر میں بھی اس میں ایسی کشش تھی اور طبیعت میں ایسی تنگنگی کہ بد معاشوں اور پارساؤں کو برابر متاثر کر لیتی تھی۔ ان عورتوں کا گھناؤنا کردار یہ ہوتا ہے کہ شریف گھرانے کی لڑکیوں کو بھی درغلا کر ان کی آشنائی کسی سے کر دیتی ہیں۔ بیگی کی اپنی جوانی کچھ ایسی ہی گزری تھی کہ اسے اپنی نسکین کا سامان کرنا پڑا۔ اس کی شادی ایسے لڑکے سے کر دی گئی تھی جو دماغی لحاظ سے مغلوب تھا۔ امیروں کا لڑکا تھا۔ بیگی کو انہوں نے منہ مانگے دام دے کر اپنے پاگل لڑکے کے ساتھ بیاہ دیا تھا بیگی زندہ دل لڑکی تھی۔ اس نے دل کو مر دہ نہ ہونے دیا اور نت نئی دوستیوں کی عادی ہو گئی۔ شادی کے آٹھویں سال اس کا پگلا دہلا ہات منڈیر سے صحن میں گرا اور مر گیا۔ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ اسے بیگی نے گرایا تھا۔ واللہ اعلم۔ اس وقت اس کا نام بیگی نہیں فرزانہ تھا۔ شادی کے بعد فرزانہ بیگ کہلانے لگی اور پھر لوگ اسے بیگی کہنے لگے۔

میں نے جب اسے دیکھا تو وہ اپنا نام شاید بھول گئی تھی۔ اس نے نام بیگی بتایا تھا۔ وہ میرے تھانے کے علاقے کی ایک مجرم تھی جو مجھے اس لیے اچھی نہ لگی کہ مجرم تھی اور یہ نفس بھی ہوا کہ وہ مسلمان تھی لیکن پولیس کو دوچار ایسے مجرم پالنے پڑتے ہیں جو مجرموں کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ میرے لیے بیگی کا مجرم وجود لازمی تھا۔ اس نے میری بہت مدد کی۔ اب اس شریفانہ آدمی کی بیٹی لاپتہ ہو گئی تو میں نے رکھنا تھا کہ کہا کہ وہ بیگی سے پوچھے کہ اس لڑکی کا کسی کے ساتھ یا رانہ تھا یا نہیں اور یہ لڑکی کیسی ہے۔ پوری ہدایات کے ساتھ یہ کیس رکھنا تھا کہ سو نپ کر میں قتل کے کیس میں اُچھ گیا۔

مقتول کی بیوہ سے پوچھ گچھ کی اور اس سے پوچھا کہ اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ اس کا خاندان کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ”وہ میرے بچوں کا باپ تھا۔ میں

گھرانوں میں بھی مقبولیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ شریفوں کے ساتھ ایسی شریفانہ باتیں کرتی ہیں کہ زاہد اور پارسا لگتی ہیں اور بد معاشوں سے ہنگام ہوں تو انہیں انگلیوں پر سچا دیتی ہیں۔ انسان کی کمزوریوں، دکھتی رنگوں، خواہشوں اور آرزوؤں کو نفسیات کے ڈاکٹروں کی طرح سمجھتی ہیں۔ ان عورتوں کا کام ہوتا ہے رشتے ناٹے کرانا، آشنائی کرانا، پیغام رسانی کرنا۔ بچھڑے ہوئے دلوں کو ملانا، جہاں وہ ملیں وہاں پہرہ دینا اور منمانگی اجرت لینا۔ کسی باعزت گھرانے کی لڑکی کا رشتہ باعزت گھرانے میں کرانا ان کا کمال ہوتا ہے۔ روتوں کو ہنسنا دینا، ہنستوں کو رولا دینا، خود ہنستے ہنستے اس طرح رو پڑنا کہ آنسو تھکنے میں نہ آئیں ان عورتوں کا خصوصی وصف ہوتا ہے۔ ہونٹوں پر جیسی مسکراہٹ چاہیں لاسکتی ہیں۔ چالیس سال کی عمر میں وہ ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایسا تاثیر پیدا کر سکتی ہیں کہ بیس یا بیس سال کا نوجوان اپنی ہم عمر لڑکی کو چھوڑ کر ان کے قدموں میں جا کرے۔ ایسی عورتیں گھر گھر کی خبر رکھتی ہیں۔ شہر کی زیادہ سے زیادہ عورتوں کو جانتی ہیں اور ہر ایک لڑکی اور عورت کے اندر باہر کے حالات بتا سکتی ہیں۔

یہ کام ان کے فطری تعاضنوں کے عین مطابق ہوتا ہے۔ اس سے انہیں نفسیاتی خلفشار سے ذرا نجات مل جاتی ہے اور انہی اوصاف سے وہ پیسہ کماتی ہیں۔ ایسی عورتیں دیہات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ شہروں اور قصبوں میں بھی انہیں کوئی باقاعدہ ٹریننگ نہیں دی جاتی۔ ایک خاص قسم کا پس منظر اور خاص قسم کے حالات ہوتے ہیں جو اس قسم کی عورتوں کو جنم دیتے ہیں۔

بیگی ایسی ہی عورت تھی۔ میں نے جب اس تھانے کا چارج لیا تو مجرموں کی فوج کے ساتھ بیگی کا بھی مجھے چارج دیا گیا تھا۔ اُس وقت اس کی عمر اڑتیس سال تھی اور پولیس کے

فرمائش کرے تو دوستی بھی کرائی ہوتی تھی۔ بیگی نے بتایا کہ یہ لڑکی اپنی مرضی سے کسی کے ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔ بیگی نے بتایا کہ اس لڑکی کی برطمی بہن شادی شدہ ہے مگر گھر بیٹھی ہے کیونکہ خاندان کو اس کے چال چلن پر شبہ ہے۔ بیگی نے کہا۔ ”میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ بدچلن نہیں۔“

”تم کس طرح جانتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں پیغام لے کر جاتی تھی لیکن اس لڑکی نے مجھے دھتکار دیا تھا۔“ بیگی نے جواب دیا اور ایک ایسا انکشاف کیا کہ میں چونک اٹھا۔ اس نے کہا۔ ”یہ جو آدمی قتل ہو گیا ہے وہ اس شادی شدہ لڑکی کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا تھا۔ وہ کبھی اس کی دکان میں کچھ خریدنے کے لیے گئی تھی۔ دکاندار اس پر مرثا۔ اس نے یہ کام مجھے سونپا کہ اس کا اس کے ساتھ دوستانہ کرا دوں۔ میں دو بار اس آدمی کا پیغام لے کر اس لڑکی کے گھر گئی۔ دونوں بار اس کا خاندان آگیا۔ میں تیسری بار گئی تو اس لڑکی نے مجھے گالیاں دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہ دراصل ایسی ویسی ہے ہی نہیں لیکن خاندان اسے اپنے گھرے جاتا نہیں۔“

بیگی کے ساتھ اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں لیکن میں سوچتا رہا کہ اس لڑکی کے خاندان نے ہی سالی کو کم نہ کر دیا ہو۔ اس کے ساتھ مقتول کا تعلق بھی تھا اس لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس آدمی کے ساتھ گفت گو کی جائے۔ وہ تعلیم یافتہ شہری تھا۔ میں نے صبح کے وقت اسے تھانے بلایا۔ ہر شہری کی طرح جسے تھانے بلایا جاتا ہے وہ ڈر اٹھتا تھا۔ میں نے تسلی دلا کر دے کہ اس کا حوصلہ تازہ کیا اور پوچھا۔ ”اپنی بیوی کو بساتے کیوں نہیں؟“ وہ اس قدر خوفزدہ تھا کہ غلاموں کی طرح بولا۔

”اس کا مردہ خواہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے کیے کی سزا پالی ہے۔“

اس عورت کے دونوں بھائیوں کو بلایا۔ انہیں بہت پکڑ دیئے اور میں ان کے انداز سے اور باتوں سے یہ اندازہ کر تا رہا کہ ان میں ایسا سنگین جرم کرنے کی ہمت ہے کہ مجھے ان میں ایسی بہت نظر نہیں آئی۔

خاندان سے بدچلن کہتا تھا

دو دن گزر گئے۔ دیہات سے کوئی کام کی خبر نہیں آ رہی تھی۔ کام کی صورت اتنی ہی خبر ملی کہ دفعہ کی رات ایک گاؤں کے ایک آدمی نے دو آدمیوں کو گاؤں کے قریب سے گزرتے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت تھی۔ اس آدمی نے میرے مخبر کو بتایا کہ اسے ایسی آواز سنائی دی تھی جیسے عورت رو رہی تھی۔ اس نے اس خیال سے دھیان نہ دیا کہ یہ لوگ کسی ماتم پر جا رہے ہوں گے۔ انھیں اسے اسے سلتے سے نظر آئے تھے جن میں صاف پتہ چلتا تھا کہ ان کے ساتھ ایک عورت ہے۔

راستہ کے غالباً فوج رہے تھے۔ میں اور رگھوناتھ تھانے کے لان میں کرسیوں پر بیٹھے گپ شپ لگا رہے تھے۔ بیگی آگئی۔ کہنے لگی۔ ”اندر چلو۔ یہاں کوئی دیکھ لے گا۔“ میں اسے اور رگھوناتھ کو اپنے ڈیرے میں لے گیا۔ بیگی لاپتہ لڑکی اور اس کے خاندان کے متعلق رپورٹ دینے آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ جو لڑکی لاپتہ ہوئی ہے وہ نیک اور شریف لڑکی ہے۔ خاندان بھی نیک ہے۔ بیگی اس لڑکی کو ذاتی طور پر جانتی تھی۔ اس کی نظر ہر لڑکی اور لڑکے پر رہتی تھی کیونکہ اسے بڑھے ناطے کرنے کا کاروبار چلانا ہوتا تھا اور کوئی

گھر بھیج دیا۔

میں نے اس پر کم و بیش دو گھنٹے جرح کی لیکن قتل کی واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نظر نہ آیا۔ اس سے اس کی سالی کے متعلق پوچھا تو اس نے حیرت کا اظہار کیا اور کہا۔ ”میں اسے شریف لڑکی سمجھتا رہا ہوں لیکن اپنی بیوی کو بھی میں شریف ہی سمجھتا تھا۔ یہ لڑکی رسائی، میرے پاس تین چار دفعہ آئی تھی اور مجھے کہا تھا کہ میں اس کی بہن پر جھوٹا الزام عائد کر رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ دکاندار مقتول ہونے مجھے یقین دلایا ہے کہ تمہاری بہن اس کے پاس جاتی رہی ہے۔ میری سالی نے مجھے بڑبھلا بھی کہا تھا۔“

اس آدمی کی باتیں کچی کچی اور دوغلی تھیں۔ وہ بیک وقت بزدل بھی تھا اور دلیر بھی۔ کبھی وہ یوں بات کرتا جیسے بے حد کمزور اور ڈرپوک آدمی ہے اور کبھی یوں شیر ہو جاتا جیسے میرے منہ پر گھونٹہ دسے مارے گا اس قسم کے لوگ ہمیشہ انتہائی قدم اٹھایا کرتے ہیں۔ ان میں غصے کی لہر آجاتے تو قتل یا خودکشی کر لیتے ہیں اور اگر دوسری لہر آجائے تو دشمن کے پاؤں میں سر رکھ دیتے ہیں۔ بیگی نے ایک اور ملاقات میں مجھے بتایا تھا کہ اس آدمی کو اپنی بیوی کے خلاف دہم ہو گیا ہے اور مقتول نے اس کی بیوی کو ذلیل کرنے کے لیے اس کے خاندان کو بھڑکا دیا ہے۔ بہر حال میں نے اس آدمی کو کوہ دیا کہ وہ ہر روز صبح کے وقت تھانے میں آجایا کرے۔ میں اسے قتل کی واردات یا اس کی سالی کی گشادگی کے ساتھ کسی نہ کسی حد تک وابستہ سمجھنے لگا تھا اور میں یہ بھی سمجھنے لگا تھا کہ مقتول اس کی بیوی کو اس کے خاندان کے دل میں غلط فہمی پیدا کر کے بیک میل کرتا رہا تھا۔ میری اس رائے کی تصدیق بیگی نے بھی کی تھی۔

”بسوں گا جناب آج ہی اسے گھر لے جاؤں گا“

”تم اسے گھر لے جاؤ یا نہ لے جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ اسے تم نے گھر سے کیوں نکال دیا ہے؟ کیونکہ اس کا چال چلن اچھا نہیں؟“

”ہاں حضور! اس نے جواب دیا۔ یہی بات ہے۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا تھا کہ اس کا چال چلن اچھا نہیں؟ میں نے پوچھا۔“

”ہمارے محلے میں ایک بدکار عورت رہتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس کا نام بیگی ہے۔ وہ مردوں عورتوں کے بارانے لگاتی رہتی ہے۔ میں نے اسے دو تین بار دیکھا کہ میری غیر حاضری میں میری بیوی کے ساتھ رازداری سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر میں نے اپنی بیوی پر نظر رکھی۔ ایک بار اسے اس دکاندار کے گھر جاتے دیکھا جو قتل ہو گیا ہے اور پھر ایک بار اسے اس کی دکان سے نکلتے دیکھا۔ یہ دکاندار مارا گیا ہے۔ انداس کے گناہ معاف کرے۔ سخت بدکار آدمی تھا۔ شریف لوگ اس کے سائے سے بھی بدکتے تھے۔ یہ عورت جس کا نام بیگی ہے اس کی دلالی کرتی رہی ہے۔ بیگی کو وہ خوب مال کھلاتا تھا۔۔۔۔“

”میں غیرت کے جوش میں ایک روز اس دکاندار کی دکان پر چلا گیا۔ میں یہ سوچ کر گیا تھا کہ شاید یہ بکثت میری بیوی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں تیار ہو کر گیا تھا مگر اس سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ تم اپنی بیوی کو سنیا لو۔ میں اتنا کہینہ نہیں ہوں کہ محلے کی بہو بیٹیوں کا بھی خیال نہ کر دوں۔ میں خود تمہارے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا۔ اچھا ہوا کہ تم خود ہی آگئے۔ تمہاری بیوی میری دکان میں آجاتی ہے۔ میں نے اسی روز بیوی کو

جیسے وہ مجھے جانتا پہچانتا ہو۔ اس نے کوئی بیہودہ بات نہیں کی۔ میں بھی اسے ایک بااخلاق دکاندار سمجھ کر اس کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ میں نے چوڑیوں کا ایک سیٹ ، ایک انگلیہ، دو گز رین اور دو پراندیاں لیں۔ اس نے بہت ہی کم قیمت لی جس سے میں حیران ہوئی۔ وہ باتوں باتوں میں مجھ سے میرے گھر کا پتہ، والد صاحب کا اور خاوند کا نام پوچھ چکا تھا۔ میں نے قیمت کے متعلق اسے کہا کہ آپ مال اتنا سستا بیچتے ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ صرف تمہارے لیے ہے کیونکہ تم میری پڑوسن ہو۔ میں تمہارے آبا جنان کا برخوردار ہوں.....

” اس طرح اس نے میرے دل میں احترام سا پیدا کر دیا۔ دو تین روز بعد ہمارے محلے کی ایک بڑی ہی بدنام عورت میرے پاس آئی۔ اس کا نام بیگی ہے۔ میرے میکے گھر آیا کرتی تھی اور میری امی کو میرے لیے رشتے بتایا کرتی تھی۔ اب میں اپنے خاوند کے گھر تھی۔ وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ بیگی امی تو میرے ساتھ پیار اور محبت کی باتیں کرنے لگی۔ اس پر بخت عورت میں یہ وصفت ہے کہ اپنے دشمنوں کے دل بھی موہ لیتی ہے۔ اس نے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور بڑی اسادی سے اس دکاندار کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کی تعریفیں کرنے لگی۔ ” میں نے کچھ بھی محسوس نہ کیا۔ اچانک میرا خاوند آگیا۔ بیگی کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ بیگی چلی گئی تو خاوند نے مجھ سے پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا باتیں ہو رہی تھیں؟ میں نے انہیں بتایا کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ انہوں نے ذرا غصے سے کہا کہ آئندہ یہ عورت یہاں نہ آئے۔ میرے خاوند میں یہ خامی ہے کہ وہی ہے۔ دو روز بعد بیگی پھر آگئی۔ میں دعائیں کرنے لگی کہ یا خدا! وہ نہ آجائیں۔ مجھ میں اتنی پیلاگی نہیں تھی کہ اس چالاک اور ہوشیار عورت کو ٹال کر گھر سے نکال دیتی۔ وہی تہو جاس کا ڈر تھا۔

وہ آگے اور غصے میں دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اب کے بیگی نے بڑے اچھے ہیمے میں میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ دکاندار مجھے چاہتا ہے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اسے ٹالا۔ وہ چلی گئی تو خاوند نے صاف الفاظ میں میرے چال چلن کے خلاف شک کا اظہار کر دیا۔....

ان کا وہم دُور کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ میری قسمیں ان کا شک رفع نہ کر سکیں۔ اگلے روز وہ کٹنی، بدکار پھر آگئی۔ میں نے سوچا تھا کہ اسے شرافت اسے سمجھا دوں گی کہ یہاں نہ آیا کرے لیکن اس نے اس دوزخی دکاندار کا پیغام مجھے دے کر میرا حلقہ بگڑا دیا۔ میں نے اسے گالی گلوچ کر کے گھر سے نکال دیا۔ دو ہی دن گزرے ہوں گے کہ وہ ان سے میں سے کسی نے ایک لفاظی اندر پھینکا۔ میں نہیں دیکھ سکی کہ وہ کون تھا۔ خاوند گھر نہیں تھا۔ لفاظی کھولا تو اسی دکاندار کا پیغام نکلا مگر الفاظ ایسے تھے کہ میں یہ رقعہ خاوند کو نہیں دکھا سکتی تھی۔ مثلاً اس قسم کے الفاظ کہ میں انتظار کرتا رہا اور تم نہ آئیں۔ اگر یہ رقعہ خاوند دیکھ لیتا تو اسے یقین ہو جاتا کہ میں اس کے پاس جاتی رہتی ہوں۔ میں نے رقعہ چھاپا کر جلادیا اور سوچنے لگی کہ بدعاش مرد مذلت لبت لڑکیوں کے بیچھے اس دیر میں سے بھی پڑ جایا کرتے ہیں؟ میں نے برد سے میں نہ سگی گز دیر تھی اور پردے میں ہی گز رہی تھی....

” میں اس کے گھر چلی گئی اور اس کی بیوی کو بتایا کہ اپنے خاوند کو باز کر آئے۔ مجھے توقع تھی کہ وہ تڑپ اٹھے گی کہ اس کا خاوند ایسا ہے۔ لیکن اس نے کہا۔ وہ تو میرا نام کا خاوند ہے۔ مردود نے باہر نہ جاتے کتنی بیویاں رکھی ہوں ہیں۔ جب کبھی شکایت کرتی ہوں تو برتن توڑ دیتا ہے، گالیاں بکتا ہے اور ایک دو تھپیر بھی جھڑکتا ہے۔ میں تو

بڑی بہن ڈر لوک چھوٹی دلیر

اس کا فرکے پتے پال رہی ہوں۔۔۔

”میں اپنا سامنہ لے کر اس کے گھر سے نکلی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا وہی خاندان میرا پیچھا کر رہا ہے۔ میں اس دکاندار کی دکان پر چلی گئی۔ اس پر خوب برسی۔ منہ میں جو آ یا کب ڈال لیکن وہ ہنستا رہا اور محبت کا اظہار کرتا رہا۔ میں گھر آئی تو یہ اطمینان ہوا کہ خاندان نہیں آیا تھا۔ اس سے اگلی شام میری قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ خاندان گھر آیا تو اس نے یہ حکم سنایا کہ ابھی اپنے گھر چلی جاؤ۔ میں تمہیں نہیں رکھ سکتا۔ میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ اس نے کہا۔ تم سمجھتی ہو کہ میں درکشاپ میں چلا جاتا ہوں تو تم آزاد ہو جاتی ہو۔۔۔ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ کل تم اس بد معاش کے گھر گئیں۔ وہ تمہیں دہان نہ ملا تو اس کی دکان پر گئیں۔ جب تم دہان سے نکلیں تو میں اس بدکار سے ملا۔ میں اسے قتل کرنے کے لیے گیا تھا لیکن اس نے مجھے بتایا کہ وہ نہیں بلکہ تم اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہو۔ وہ کہتا ہے کہ اسے محلے داری کا خیال ہے اور تم اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ اگر تم سچی ہو تو اس کے گھر اور اس کی دکان پر کیوں گئی تھی۔۔۔

”میں اسے بتا نہیں سکتی تھی کہ اس نے مجھے زبانی اور تحریری یہودہ پیغام بھیجے ہیں ورنہ وہ پوچھتا کہ رقعہ کہاں ہے۔ میں ایسے پکڑ میں آئی جس سے نکلتا مجھے اتنا ہی نہیں تھا۔ میں غم اور غصے سے جلتی تھی۔ مضمعتی اپنے گھر آئی۔۔۔

”اجی اور آبا جان کو بتایا تو انہوں نے سر پٹ لیا۔ میری چھوٹی بہن نے سنا تو اس پر پاگل پن کا دردہ پڑ گیا۔ یہ اس کی ایک کمزوری ہے۔ برداشت تو کرتی ہی نہیں۔ اب بھی مجھے ڈر ہے کہ اسی پاگل پن میں گھر سے نکل گئی ہے اور دریا میں ڈوب مری ہے۔

”کیا وہ واقعی یا گل ہے؟ میں نے پوچھا۔

”بہنیں! اس نے جواب دیا۔ اچھی خاصی عقلمند اور سلیقہ شعار لڑکی ہے۔ اگر اُسے غصہ آجائے تو پاگلوں کی حرکتیں کرنے لگتی ہے۔۔۔۔۔ پھر توں ہوا کہ میری اجی اور آبا جان میرے خاندان کے پاس گئے۔ اس وہمی آدمی نے دو چار اور باتیں گھر کے مجھے بد چلن قرار دے دیا۔ ہم دوہی بہنیں ہیں۔ خدانے بھائی دیاسی نہیں۔ ہماری آپس میں سہیلیوں کی طرح رازداری اور بے تکلفی ہے۔ چھوٹی بہن نے مجھ سے پوچھا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ میں نے اسے اصل واقعہ سنا دیا۔ وہ میرے خاندان کے پاس گئی اور اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔

معلوم نہیں کس کی نظر لگی۔ ہماری اتنی پیاری اور باعزت زندگی تباہ ہو گئی۔ دن گزرنے لگے۔ ایک روز رنگی یہاں بھی آگئی۔ میری ماں کے پاس بیٹھ کر میرے متعلق افسوس کا اظہار کیا پھر میرے خاندان کے خلاف باتیں کیں۔ میرا بس چلتا تو میں اس کا گلا بادیتی۔ وہ میرے پاس آ بیٹھی اور بڑے پیار سے کہنے لگی کہ تمہاری یہ حالت میری وجہ سے ہوئی ہے۔ گجرات نہیں۔ میں تمہارے خاندان کا دامخ صحیح کروں گی۔ اس قسم کی باتوں سے اُس نے میرے دل پر قبضہ کر لیا اور کہا۔ تمہارے پاؤں دراصل وہ نہیں جھنڈے دے رہا۔ وہ جو تم پر مارتا ہے۔ تم صرف ایک بار اس کے پاس چلی جاؤ۔ اس نے قسم کھائی ہے کہ صرف ایک بار آجائے پھر وہ تمہارے خاندان کے دل سے سارے وہم نکال دے گا۔ میں نے رنگی کو کالی گلوچ کی گھر اس پر فوڈہ بھرا ثر نہ ہوا۔ اثنابولی۔ تم شادی شدہ ہو۔ تمہارا کیا بگڑ جائیگا۔ ورنہ ساری عمر گھر بیٹھی رہو گی اور لوگ تمہیں بد چلن سمجھتے رہیں گے۔۔۔

”اسے لعنت ملامت کر کے گھر سے نکالا۔ منہ چھپا کر رونے کے سوا میں کر بھی

میں اسے دکاندار مل گیا۔ اس نے بڑھے میں بھی میری بہن کو پہچان لیا۔ اسے روک کر کہتے لگا۔ تم دونوں بہنیں پتھر ہو۔ اس کی ازدواجی زندگی بچالو۔ آؤ میرے ساتھ۔ آؤ بے پونے کھٹے بعد واپس آجانا۔ بہن نے اسے دھتکارا تو اس نے دھکی دی۔ یاد رکھو۔ تمہارا رشتہ جہاں کہیں بھی بندھا میں دہاں جا کے کہ دوں گا کہ اس لڑکی کے ساتھ میرے تعلقات ہیں۔ میری بہن سٹیٹانی ہوئی گھر آئی اور یہ بات مجھے سنائی۔ میں تو ڈر لوک ہوں۔ وہ دیر سے مگر روٹی اور کھانے لگی کہ ہمارے ایک دو بھائی ہوتے تو آج ہمارا یہ مشرہ ہوتا۔۔۔

”دوسرے دن ہمارے ہاں میری اس بہن کے رشتے کے لیے مہمان آگئے۔ آبا جان نے صحن میں مرغی ذبح کی۔ میں اور بہن دیکھ رہی تھیں۔ میری بہن نے مجھ سے پوچھا۔ باجی! اس چھری سے انسان کی گردن کٹ سکتی ہے؟ میں نے جواب دیا۔ کیوں نہیں کٹ سکتی۔ ایک فٹ لمبی چھری ہے۔ یہ تو بیل کی بھی گردن کاٹ لے۔ یہ بات مذاق کے رنگ میں ہوئی تھی مگر میں نے دیکھا کہ اس پر عجیب طرح کی خاموشی طاری ہو گئی اور وہ مرغی کے خون کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ چپ چپ ہی رہی۔ اس کا رشتہ طے ہو گیا۔ بڑا اچھا گھر انہیں ہے۔ اب تو معاملہ ہی چرچٹ ہو گیا ہے۔ رشتہ طے کر کے مہمان اگلے روز چلے گئے تو بہن نے مجھے کہا۔ اس نے دھکی دی تھی کہ جہاں تمہارا رشتہ ہوگا وہاں کہ دوں گا کہ اس لڑکی کے میرے ساتھ تعلقات ہیں۔ اس نے تمہیں بھی اجاڑا ہے۔ مجھے بھی اجاڑے گا۔ پھر وہ چپ ہو گئی۔۔۔

”وہ تین دن چپ رہی۔ میں نے اسے ہر وقت گہری سوچ میں گم دیکھا۔ ایک شام میں نے اسے باورچی خانے میں دیکھا۔ وہی چھری ہاتھ میں لیے کچھ سوچ رہی

کیا سکتی تھی۔ میں نے چھوٹی بہن کو بتایا کہ آج یہ بات ہوئی ہے۔ وہ اتنی اور آبا جان کو بتائے بغیر میرے خاوند سے ملی اور اسے بتایا اور اسے شرم بھی دلائی مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ ایک روز بہن مجھے بتائے بغیر کسی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے اس مردود کاغذ کے پاس چلی گئی۔ واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ بہت اگھڑی اگھڑی سی تھی میں نے پوچھا کہ اپنی سہیلی سے لڑ کر آئی جو بے شب اس نے بتایا کہ وہ اس دکاندار کی دکان پر گئی تھی اور اسے کہا کہ اس نے ایک جوان لڑکی کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ اس نے میری بہن کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ میری بہن اس کے آگے روئی بھی۔ اس کی منت بھی کی اور کہا کہ وہ میرے خاوند سے یہ کہہ دے کہ یہ سب جھوٹ تھا مگر اس دوزخی نے پوری بے شرمی سے میری بہن کو کہا۔ تمہاری بہن نے میری بات ایک بار بھی نہیں مانی۔ اس کی جگہ تم عقوڑی سی دیر کے لیے آجاؤ۔ میں تمہارے بہنوئی کو یقین دلا دوں گا کہ تمہاری بیوی پاک صاف عورت ہے۔ ظاہر ہے کہ میری بہن ایسی بات بڑاشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اسے دھتکار دیا تو وہ بولا۔ اگر بہن کو خاوند کے گھر آباد کرنا چاہتی ہو تو میری بات مان جاؤ۔ یہ ساری دکان تمہاری ہے۔ جو کچھ پسند ہے اٹھالے جاؤ۔۔۔۔

”میں سمجھ گئی کہ یہ غنڈہ اتنا دلیر کیوں ہے اور میں یہ بھی جان گئی کہ میرا خاوند میرے والدین کی پردہ کیوں نہیں کرتا۔ صرت اس لیے کہ ہمارا کوئی بھائی نہیں کوئی ماموں نہیں، چچا نہیں، تایا نہیں۔ ایک آبا جان ہیں، وہ بوڑھے بھی ہیں اور بھلے ہاں بھی۔ ہم دونوں بہنیں انہیں کوئی بات بتائی ہی نہیں تھیں۔۔۔۔

”ایک روز میری بہن کسی گھر سے واپس آ رہی تھی۔ برقعے کا نقاب نیچے تھکا۔ راتے

ماں پر تو سکتے طاری ہو گیا۔ دوپٹے پر خون تھا۔ ساتھ چھری تھی۔ ماں اور بہن
خوش پر نش نہ کھاتیں تو کیوں نہ کھاتیں۔ وہ جان گئی تھیں کہ ان کی بچی قتل ہو گئی ہے۔ انہیں
سنجانا مشکل ہو گیا۔ باپ دل گڑے والا آدمی تھا۔ مجھے باہر لے گیا اور بڑے تحمل سے پوچھا
کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ
لو کی قتل ہو گئی ہے۔ دعا اور انتظار کریں۔ انہیں جھوٹی تسلیاں دے کر میں نے گھڑبھج دیا
اور کہا کہ دعا کریں۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ ان کے ہاں بچی کی سلامتی کے لیے تین دن قرآن
خوانی ہوتی رہی تھی۔

جن بہنوں کے بھائی نہیں ہوتے

میرے لیے یہ عمر تھا کہ کیا لڑکی نے قتل کیا ہے یا وہ قتل ہوئی ہے؟ ایک قیاس یہ آتا
تھا کہ مقتول اپنے لڑکی کو اغوا کر لیا اور اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ یہ سنا لڑکی
کو لے آئے مگر لڑکی گھر سے پھری لے کر کیوں گئی تھی؟ اُدھر میرے مخبر وغیرہ دو سکھوں کو ڈھونڈ
رہے تھے۔ میں نے انہیں نی لائن دی اور بتایا کہ اب دیہات میں کوئی شہری لڑکی
ڈھونڈو۔ گھرے صاف تھے۔ لڑکی کو زبردستی لے جایا گیا تھا اور گھر سے دیہات کی طرف
گئے تھے۔ یہ کام ہرے مخروں کے لیے مشکل نہیں تھا۔

میں نے کھوج کو پھر بلایا اور اسے گھروں کے نشان دکھا کر کہا کہ وہ ذہن پر زور
دے کر ان آدمیوں کے گھروں کو پہچانے۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے کہ وہ تجربہ کار بوڑھا
کھوج تھا۔ اس نے کہا کہ آپ اُس روز مجھے واپس لے آئے تھے۔ ان میں ایک

تھی۔ میں باورچی خانے میں داخل ہوئی تو اس نے چونک کر چھری رکھ دی۔ پھر معلوم نہیں
دہ کس وقت، باہر نکل گئی۔ بہت دیر تک نہ آئی۔ اتنی نے دیکھا کہ اس کا برقعہ کمرے میں
پڑا ہے۔ وہ بڑھتے کے بغیر نکل گئی تھی۔ پھر واپس نہیں آئی۔

میں چھری پر چونک پڑا تھا۔ میرے ذہن میں ایک پیکر چل پڑا۔ وہ غصے میں
پاگل ہو جاتی تھی۔ دیر تھی۔ اس نے پوچھا تھا کہ اس چھری سے انسان کی گردن کٹ
سکتی ہے؟ ... مقتول کی بلیک میلنگ اور دھمکیاں — میری چھٹی جس بیدار ہو گئی۔
میں نے بڑی بہن سے پوچھا — ”وہ چھری کہاں ہے؟ جاؤ دیکھو ذرا، اگر مل جاتے تو مجھے
دکھاؤ“ وہ چلی گئی اور خاصی دیر سے آئی۔ کہنے لگی — ”امی کہتی ہیں کہ وہ چھری کئی روز
سے نہیں مل رہی۔ اب چاقو استعمال کرتے ہیں“ — مجھے کچھ ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔
اسی بات سن کر میں نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ میں نے لڑکی کے باپ کو بلایا اور
اسے کہا کہ آپ سب میرے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے تھانے چلیں۔ وہ میرے ساتھ چل
پڑے۔ میں انہیں تلنگے میں تھانے لے گیا۔ میں نے وہ چھری بھولاش کے قریب
پڑی ملی تھی انہیں دکھائی اور پوچھا کہ وہ اسے پہچانتے ہیں؟

لڑکی کی ماں نے چھری کو بڑی غور سے دیکھا اور کہا — ”یہ تو ہماری ہی لگتی ہے اور یہ
اُس روز سے غائب ہے جس روز سے میری بچی لاپتہ ہوئی ہے۔“
میں نے دوسری چیزیں بھی جو برآمد ہوئی تھیں، درازوں سے نکال کر میز پر رکھ دیں۔

ان میں ایک دوپٹہ تھا جس پر خون کے داغ دھبے تھے۔ سینڈل کا ایک پاؤں تھا اور
چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ یہ چیزیں دیکھتے ہی لڑکی کی بڑی بہن چیخ کر بولی — ”ہاتے میرے
اللہ یہ تو میری گڈی کا سینڈل ہے۔ دوپٹہ بھی اسی کا ہے۔ چوڑیاں بھی اسی کی ہیں۔“

کمرے کے متعلق مجھے کچھ شک ہے۔ جس طرف یہ کمرے جارہے تھے اُدھر ایک پرانا دارو دیا رہتا ہے۔ آپ اسے جانتے ہوں گے۔ اسے بلا وارداتیا کہتے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ ان میں سے ایک کمرہ اس کا ہے۔ آپ کے یہاں آنے سے پہلے بھی میں یہ کمرہ دیکھ چکا ہوں۔ شاید تین سال گزرے دیکھا تھا۔“

رگھوناتھ کو میری اس نئی قیاس آرائی سے اتفاق نہیں تھا۔ کہنے لگا کہ ملک صاحب! آپ کا دماغ اچھا بھلا ہے۔ ذرا سوچئے کیا ایک پردہ نشین کنواری لڑکی رات کے وقت چھری سے ایک غنڈے کو بھلاقتل کر سکتی ہے؟ میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔ ”رگھوناتھ! جن بہنوں کے بھائی نہیں ہوتے وہ سب کچھ کر سکتی ہیں۔ وہ ہتھیار ڈال بھی دیتی ہیں اور ہتھیار اٹھا کر ہم جیوں کے پیٹ بھی بھاڑ سکتی ہیں۔“

میں نے بلا وارداتیا ابھی دیکھا نہیں تھا۔ تھانے میں اس کا فوٹو اور پورا ریکارڈ موجود تھا۔ تین بار کا سزا یافتہ تھا۔ اس کا پیشہ رہنری تھا اور کانیں بھی توڑتا تھا۔ میں نے کسی کہانی میں آپ کو نامی گرامی ڈاکوؤں کے متعلق بتایا تھا۔ جنہیں پکڑنے کے لیے فوج بھی استعمال کی جاتی تھی۔ پتا اس کلاس کا ڈاکو نہیں تھا۔ وہ درمیان درجے کا جرائم پیشہ تھا۔ ایسے لوگوں کو وارداتیا بھی کہا جاتا تھا۔ اس درجے کے جرائم پیشہ پردہ فروشی بھی کیا کرتے تھے۔ یہ اکثر دیہاتی علاقوں میں رہا کرتے تھے۔ وہ جس گاؤں میں رہتے تھے اس کی عزت کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ گاؤں میں کوئی بدعاشی نہیں کرتے تھے۔ جس گاؤں میں کوئی ایسا جرائم پیشہ رہتا تھا جسے دوسرے جرائم پیشہ جانتے ہوں تو وہ اخلاقاً اس گاؤں میں کوئی واردات نہیں کرتے تھے۔ اس گاؤں کے باشندے محفوظ رہتے تھے اور وہ اس کے جواب میں اپنے گاؤں کے وارداتیا کو

شخص دیتے تھے۔ وہ چوری کا مال یا کوئی مغویہ عورت گاؤں میں لاتے تو گاؤں کا کوئی فرد اس کا سراغ نہیں دیتا تھا۔ لوگوں کے اس رویے سے پولیس کے لیے مشکل پیدا ہو جاتی تھی۔ مجبوروں کو میں نے بتے وارداتیا سے گاؤں بتایا تو دوسرے ہی دن مجھے اطلاع مل گئی کہ بلا ایک عورت لایا ہے جو ابھی اس نے آگے نہیں چلائی اور وہ خود بھی گاؤں میں ہے۔ مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ یہ وہی لڑکی ہوگی جو لاپتہ ہو گئی ہے اور مقتول کو اسی لڑکی نے یا بتے نے قتل کیا ہے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرا معرکہ ہی حل کرے گا۔ میں نے آٹھ کانسٹیبل تیار کر لیے۔ انہیں گاؤں کو گھرے میں لینے کی مشق کرائی۔ رگھوناتھ کو اس کی ڈیوٹی سمجھائی۔ کانسٹیبلوں کو جو راتیں دیں وہ ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، ۹ اور ۱۰ بجے تک ہر شام راتیں تھیں جن کے کارتوس میں چھوٹے چھوٹے چھڑے ہوتے ہیں۔ یہ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے فائرنگ جاتی ہیں یا بھاگتے آدمی کو پکڑنے کے لیے۔ یہ چھڑے صرف زخمی کرتے ہیں۔ میں نے کانسٹیبلوں کو حکم دیا کہ گاؤں سے نکل کر کوئی بھاگے تو کوئی چلا دو لیکن ٹانگوں پر نہیں کسی آدمی کو شدید زخمی یا ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

گاؤں پچھلے دور تھا۔ شام کے بعد ہم روانہ ہوئے۔ میرے پاس ریوا اور تھا۔ ہماری راہنمائی کے لیے مجرنا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم گاؤں میں داخل ہوئے۔ دن بھر کے تھکے ہوئے دیہاتی سونگئے تھے۔ رگھوناتھ نے کانسٹیبلوں سے گاؤں کی ناک بندی کرنی۔ میں نے اپنے ساتھ صرف ایک کانسٹیبل رکھا۔ ہیڈ کانسٹیبل کو میں نے بتے کے مکان کے پچھوڑے بیچ دیا تاکہ پلاچھیت سے اس طرف کو دہرائے۔ مجرنا مجھے اس کا گھر دکھایا۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔ مجھے تین بار دستک دینی پڑی۔ اندر سے آواز آئی۔ ”کون ہے او“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”ارے کھو لو نا باز۔“

فلزی تھی۔ اس نے مسکراہٹ سے مجھے جیلنج کیا تھا۔ دھیمی سی آواز میں بولا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ لڑکی کے ساتھ تمہاری لاش نہ جاتے لیکن عالی جاہ لڑکی کے ساتھ میری لاش ہی جاتے گی۔“

اسلام کا رشتہ

میں نے اسے ڈرانے کے لیے اپنے سیٹ سے بندھے ہوئے ریو اور پر ہاتھ رکھا تو اس نے بڑے تحمل سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میرے دوسرے ہاتھ میں جلتی ہوئی ٹاپر تھی۔ پتلے نے سجلی کی تیزی سے اپنا دوسرا ہاتھ کرتے کے اندر ڈال کر ڈیڑھ فٹ لمبا خنجر نکال لیا۔ اس نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔ ”گولی کھا کر ایک وار تو ضرور کروں گا۔ لڑکی کے ساتھ دو لاشیں جھائیں گی۔“

میرے کانٹیلن نے رائفل کی نالی اس کے پیٹ پر رکھ دی اور کہا۔ ”ہتھیار چھینک دو۔“ میں نے کانٹیلن کو سمجھے کر دیا اور پتلے کو دوستانہ ہنسنے میں کہا۔ ”تم پاگل ہو جو پولیس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو۔“

”پر سپاہی مسلمان ہے؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے بتایا کہ ہاں یہ مسلمان ہے تو پتلے نے کہا۔ ”سنو دارو فوجی، انہ آپ ہسپتال چلائیں گے نہ میرا خنجر چلے گا۔ آپ بھی مسلمان ہیں، میں بھی مسلمان ہوں اور لڑکی بھی مسلمان ہے۔ وہ اندر ہے۔ اگر سچے مسلمان ہو تو میری ایک بات سن لو۔ اگر بات آپ کے دل کو گئی تو دونوں کی مشکل آسان ہو جائے گی، ورنہ لڑکی کے ساتھ دو نہیں تو ایک لاش ضرور جائے گی۔“

یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے۔“

دروازہ کھلا۔ ایک آدمی باہر آیا۔ میں نے اس کے چہرے پر ٹاپر کی روشنی ڈالی۔ مج نے کہا۔ ”یہی ہے۔“ اور مخزن فوراً پیچھے ہٹ گیا تاکہ پتلا اسے پہچان نہ سکے۔ ”ادھر۔“ پتلے نے عام سے لہجے میں کہا۔ ”داروغہ صاحب۔ فرمائیے حضور!“ پتلے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں لڑکی کو لینے آیا ہوں۔“

”کون سی لڑکی حضور؟“

”تمہارے پاس کتنی لڑکیاں ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”ایک ہی ہوگی۔ بس میرے حوالے کر دو۔“

”ایک بھی نہیں سرکار!“

”دیکھو پتلے۔“ میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کا سر ہلایا اور کہا۔ ”میں لڑکی کو لینے آیا ہوں۔ بہتر یہ ہو گا کہ میرے ساتھ صرف لڑکی جائے، اس کے ساتھ تمہاری لاش نہ جائے۔ میرے پاس ریو اور ہے۔ گاڈن پولیس کے گھر سے میں ہے۔ میری اتنی پاور ہے کہ تمہیں یہاں کھڑے کھڑے گولی مار دوں اور تمہارے گھر سے لڑکی بھی اندر کے لئے جاؤں۔“ میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ کم و بیش چالیس سال کی عمر کا باریب چہرے والا آدمی تھا۔ اگر اس کا تعارف کرانے بغیر اسے میرے سامنے لایا جاتا تو میں ذرا مشکل سے ہی یورائے دیتا کہ یہ شخص جرائم پیشہ ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ ”سوچو مت۔ لڑکی دے دو۔“

اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں کوئی ڈر اور گھبراہٹ نہیں بلکہ

میں نے اس پر واضح کر دیا کہ مجھے کیا عزتیں ہے اور میں کیا چاہتا ہوں۔
 اس نے کہا۔ ”اللہ آپ کا ایمان اور پکا کرے۔ اب میرا فیصلہ سن لیں۔ لڑکی آپ
 کے ساتھ تھلنے نہیں جائے گی۔ عدالت میں نہیں جھلسے گی۔ اگر آپ اپنا زور استعمال کریں
 گئے تو آپ کو لڑکی کی لاش ملے گی، شاید میری لاش بھی.... ذرا اس پر غور کرو ملک صاحب!
 میں نے اتنا قیمتی مال اتنے دنوں سے اندر کیوں رکھا ہوا ہے؟ کیا میں اتنا اناڑی ہوں
 کہ شہر میں قتل کی تفتیش ہو رہی ہے، کھوجی کھرے اٹھا رہے ہیں اور میں اتنے قیمتی
 قاتل کو گھر میں رکھے ہوتے ہوں؟ میں اناڑی نہیں ہوں ملک صاحب! اکتالیس برس
 عمر ہو گئی ہے۔ چھبیس برس سے وارداتیں کر رہا ہوں۔ گیارہ سال اٹھائی بیٹھے قید
 با مشقت کاٹ چکا ہوں۔ پولیس اور جیل خانے کی حوالالتوں میں جو وقت گزارا ہے وہ پانچ
 سال سے کم نہیں ہوگا۔ پھر خود ہی سوچو ملک صاحب! میں نے مال لگے کیوں نہیں چلایا؟
 ”خدا کے لیے بتئے! میں نے بھنگا کر کہا۔“ مطلب کی بات پر آؤ اور بات ذرا اجلی
 ختم کرو۔ مانتا ہوں تم استاد ہو لیکن اناڑی میں بھی نہیں ہوں“

”تو سنو داروغہ جی! اس نے کہا۔“ یہ لڑکی جوان، خوبصورت اور کنواری ہے۔ یہ
 میرا ہے جسے میں کسی بھی نواب، راجے یا مہاراجے کے پاس لے جانا تو روپیوں کی
 ٹھیلیاں لے آتا۔ اگر منڈی میں لے جاتا تو منہ مانگے دام ملتے لیکن لڑکی کو بلا کر پوچھ لو۔
 دربان میں قرآن رکھ دو۔ میں نے اس لڑکی کو عورت ذات سمجھا ہی نہیں۔ اس کے جسم کو
 اپنی ہاتھ لگا سکتا تھا جب اسے اٹھا کر زبردستی گاؤں میں لایا تھا۔ اُس روز سے سوچ رہا
 ہوں کہ اس لڑکی کا کیا کروں۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی۔ اللہ سبب بناتا ہے۔ آپ کو اللہ نے
 برسے پاس بھیج دیا ہے۔ اب دیکھتا ہوں کہ میری منشا پوری ہوتی ہے یا نہیں....

میں نے فیصلہ کیا کہ اس کی بات سن لی جائے۔ مجھے اپنے اوپر یہ اعتماد تھا کہ اگر لڑکی
 اس گھر میں ہے تو اسے تو میں لے ہی جاؤں گا۔ اس آدمی کو بولنے کا موقع دے دوں۔ مجھے
 یہ توقع تھی کہ وہ اپنے آپ کو بے تصور ثابت کرے گا اور کہے گا کہ لڑکی کو اس نے اغوا نہیں
 کیا بلکہ لڑکی خود اس کے ساتھ آئی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ وہی
 لڑکی ہے جس کی تلاش میں آیا ہوں۔ یہ کوئی اور بھی ہو سکتی تھی۔

پتا مجھے اندر لے گیا۔ لائٹیں جلائی اور ایک کمرے میں بٹھا دیا۔ کانسٹیبل کو میں نے صحن
 میں کھڑا کر دیا۔ پتلے نے جب اپنی بات کہی تو میرا ذہن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ میں یہ بھی
 سوچوں کیا یہ شخص مجھے بدھو سمجھ کر دھوکا دینے کا نیا طریقہ اختیار کر رہا ہے؟ لیکن میرے ذہن
 میں یہ خیال بھی آجاتا تھا کہ میں خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں، یہ وارداتیا جو کچھ کہ
 رہا ہے وہ اس کے دل کی آواز ہے۔ اس نے بات شروع کی ہی تھی کہ میں نے اسے ٹوک
 کر کہا۔ ”پہلے مجھے لڑکی دکھا دو۔ ہو سکتا ہے یہ وہ لڑکی ہی نہ ہو جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں۔“
 ”یہ وہی ہے داروغہ جی! اس نے کہا۔“ جس نے کوٹھی میں ایک شہری پر عاشر کو
 قتل کیا ہے۔“ اس نے نام بتایا تو مجھے یقین ہو گیا۔

”ملک صاحب! اس نے داروغہ سے مجھے ملک بنا دیا اور ٹھنڈی سانس بھر
 کر بولا۔“ وارداتیوں کا ریکارڈ آپ کے پاس ہوتا ہے اور تقانیداروں کا ریکارڈ وارداتیوں
 کے پاس ہوتا ہے۔ کسی داروغے کا نام لو۔ میں بتا دوں گا کہ وہ کتنی قیمت کا داروغہ ہے۔
 آپ کے متعلق پتہ چلا ہے کہ سرکار پتے مسلمان ہیں۔ سچی بات ہے میں نے نہیں مانا مسلمان
 داروغہ صرف داروغہ ہوتا ہے مسلمان نہیں ہوتا۔ اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ جناب اپنی
 قیمت وصول کریں گے یا جناب کو اپنا ایمان عزیز ہے؟

”قصیدیوں ہو کر دو قسم کی رات، میں اپنے ایک دوست کے ساتھ شہر سے آ رہا تھا۔ اس کو ٹھی کے سامنے سے گزرے تو اندر سے کسی کی آواز آئی — ہائے، مارا الا۔ کوئی پکڑنا اسے! — مجھے معلوم تھا کہ یہ کوٹھی نئی بنی ہے اور ابھی خالی ہے۔ میرا کسب جاننے میں کیا ہے۔ کوٹھیوں پر نظر رکھتا ہوں۔ آواز سن کر ہم دونوں بھاٹک کے اندر چلے گئے۔ ایک عورت کمرے سے بھاگتی ہوئی برآمدے میں آئی۔ اندھیرا تھا مگر مرد عورت پہچانے جاتے تھے۔ عورت ہمیں دیکھ کر برآمدے میں ہی بت بن گئی۔ فوراً بعد کمرے سے ایک آدمی دروازے میں آیا۔ اس کے منہ سے بڑی ڈراؤنی سی آواز نکلی اور وہ دروازے میں گر پڑا۔ میرے دوست نے لڑکی کو پکڑ لیا اور میں نے ماچس جلا کر اس آدمی کو دیکھا۔ خون تھا کہ ندی کی طرح بہ رہا تھا۔ لڑکی تو جیسے کھڑے کھڑے مر گئی تھی۔ پتھر کے مثبت کی طرح کھڑی تھی۔ اس کے دوپٹے اور شلوار پر خون کے چھینٹے تھے۔۔۔۔

”اس سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ نہیں بولی۔ ذرا تسلی دلا سہ دیا تو اس کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔ تم مجھے پولیس کے حوالے کر دو گے؟ پولیس مجھے پھانسی دے دے گی؟ — میں نے پوچھا کہ اس آدمی کو کس نے مارا ہے؟ اس نے کہا — میں نے اسے چھری سے مارا ہے۔ میں نے ماچس جلا کر دیکھ لیا تھا کہ لڑکی نوجوان اور خوبصورت ہے اور اس کے ہوش اڑے ہوئے ہیں۔ قتل تو جا بجا ہو بھی، مضم نہیں کر سکتے۔ میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے اسے قتل کیوں کیا ہے۔ میں نے صرف یہ پوچھا کہ تم اس کو ٹھی میں رہتی ہو؟ اس نے کہا، نہیں، میں شہر میں رہتی ہوں۔ اس کی دکھتی رگ پکڑ کر میں نے کہا۔ یہاں کھڑی مت رہو، ورنہ پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔ آؤ ہمارے ساتھ ہم تمہیں شہر کے باہر باہر سے گھر پہنچا دیں گے۔۔۔۔

”وہ سخت خوفزدہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ قتل کر کے قاتل کی اندر سے کیا حالت ہو جاتی ہے۔ یہ تو نوجوان لڑکی تھی۔ وہ خاموشی سے ہمارے ساتھ چل پڑی۔ میں نے اس کی قیمت کا اندازہ کر لیا تھا۔ وہ اس امید پر ہمارے ساتھ ہو گئی تھی کہ ہم اسے باہر باہر سے اور اندھیرے اندھیرے میں گھر پہنچا دیں گے۔ وہ ہم دونوں کے درمیان چلتی رہی۔ ہم نے اس سے کوئی بات نہیں پوچھی اور نہ اس نے کوئی بات کی۔ ہم اسے شہر سے دُور ویران علاقے میں لے گئے۔۔۔۔

”ایک جگہ وہ اچانک رک گئی اور بولی۔ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ میرا گھر ادھر تو نہیں! — میں نے اسے کہا کہ گھراؤ نہیں۔ ہم تمہیں پولیس سے بچانے کی ترکیب کر رہے ہیں مگر اس کا مارا ٹھکانے آ گیا تھا اور اسے شک ہو گیا تھا کہ ہم اسے کہیں اور لے جا رہے ہیں۔ اس نے ہمارے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے اسے بہت فریب دینے لیکن وہ نہ مانی۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تو وہ بیٹھ گئی۔ مجھے زبردستی کرنی پڑی۔ اسے اٹھانے لگا تو وہ جھاڑی پر لیٹ گئی۔ ہم دونوں نے اسے کھڑا کیا اور گھٹنے اور دو کھینٹے لگے۔ اس نے رونا اور چیخا شروع کر دیا۔ تھوڑی دُور لے جا کر میں نے اسے اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔ میں ایسا قیمتی دانہ بھلا کیسے چھوڑ سکتا تھا۔۔۔۔

”میں اسے یہاں لے آیا۔ وہ چیختی چلاتی تھی۔ ایک بار بے ہوش بھی ہو گئی۔ بڑی ہی شکل سے میں نے اسے سنبھالا۔ آخر اس نے کہا — میں نے اپنی اور اپنی بہن کی عزت بچانے کے لیے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔ تم کیا مجھے ہو کر میں اپنا آپ تمہارے حوالے کر دوں گی؟ میں مسلمان باپ کی بیٹی ہوں، اس نے یہ بات ایسے بچے میں کہی کہ مجھ پر جیسے کسی نے پانی کا مشکیزہ خالی کر دیا ہو۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے پوری بات سناؤ۔ اور

اس نے پوری بات سادی۔“

کنواری لڑکی رہزن کی پناہ میں

پتے نے مجھے وہی کہانی سنائی جو میں اس لڑکی کی بڑی بہن سے ملہن کے خاندان سے اور بگے سے سُن چکا تھا۔ یہ آپ کو بھی سنا چکا ہوں۔ دوبارہ سنانے کی ضرورت نہیں۔ لڑکی مقتول کو اس کو مٹی تک کس طرح لائی اور اسے قتل کس طرح کیا؟ آگے چل کر لڑکی کی زبانی سناؤں گا۔ پہلے پتے وارد اتنے کی بات مکمل کروں۔ اس نے کہا۔ ”لڑکی نے کہا کہ ہم دو بہنیں ہیں۔ بھائی کوئی نہیں۔ باپ بوزھا ہے، اسی لیے ایک غنڈے نے اتنی ڈھٹائی سے ہمیں پھانسنے کے جتن کیے، میری بہن کو ساڑھیا اور مجھے ابا لڑنے کی دھمکی دی اور میرے بہنوئی نے اس شہ پر میری بہن کو تھیکے بٹھادیا کہ ہمارا کوئی بھائی نہیں.... میں اپنی بڑی بہن کا بھائی بن گئی.... لڑکی کے ان الفاظ نے اس کی غیرت مندی اور دلیری سے مجھے انسان بنا دیا۔ اٹنا اسی سال کی عمر میں پہلی بار میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور اپنے آپ سے کہا۔ اویلتے! شرم کہ۔ بھاتا تو اس غیرت مند لڑکی پر جو کہ کے فخر کرے گا جس کا کوئی بھائی نہیں؟....“

”اللہ گواہ ہے داروغہ جی! میں نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ سُن سُنی! یہ بتا ڈکیت تیرا بھائی ہے۔ یہ گنہگار تیرا باپ ہے۔ تو میرے قبضے میں نہیں میری پناہ میں ہے تیرا جسم مجھ پر حرام ہے۔ مجھ پر بھروسہ کرو اور مجھے سوچنے دے کہ تجھے پولیس سے کیسے بچاؤں۔“ لڑکی پھر بھی ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اس کا ڈر دور کر دیا۔ میری دو بیویاں

میں ایک کے ساتھ نکاح پڑھوایا تھا، دوسری بے نکاحی رکھی ہوئی ہے۔ دونوں میری غلام ہیں۔ انہیں لڑکی کی ساری بات سنا کر لڑکی ان کے حوالے کر دی۔ انہوں نے لڑکی کو نہلا دیا۔ کما سے اپنے سینے میں ڈال لیا....“

”میرے لیے آسان طریقہ یہ تھا کہ رات کے وقت لڑکی کو اس کے گھر چھوڑا تا کہین پتہ چلا کہ لڑکی کا دوپٹہ کہیں رہ گیا ہے اور ایک سینڈل بھی کہیں رہ گیا ہے اور اس نے بتایا کہ چھری کو مٹی میں رکھی ہے تو میں نے لڑکی کو گھر لے جانے کا ارادہ بدل دیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ پولیس انہی چیزوں سے سراخ نکالیا کرتی ہے۔ اگر کوئی اور تھا تو ہوتا تو میں فکر نہ کرتا۔ آپ کے متعلق مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ کی تفتیش سے کوئی پتہ نہیں سکتا۔ میں خود کئی بار ایسی ہی چیزوں سے پکڑا گیا ہوں۔ میں نے لڑکی کی کلائی دیکھی۔ اس میں دو چوڑیاں تھیں، اور کلائی زخمی تھی۔ میں نے پوچھا چوڑیاں کتنی تھیں؟ اس نے بتایا کہ پانچ تھیں۔ باقی جائے واردات پر ٹوٹی ہوئی گی یا جب راستے میں ہم نے اسے گھسیٹا تھا۔ میں نے سوچا کہ بہت بُرا ہوا....“

”میں نے لڑکی کو سمجھایا کہ مجھے تفتیش کا رخ دیکھنے دو اور کچھ دن انتظار کرو۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بہت کوشش کی کہ آپ کی تفتیش کا رخ معلوم ہو جائے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ لڑکی کو یغم کھا رہا تھا کہ اس کے والدین اور بہن بہت پریشان ہوں گے۔ اس معاملے میں میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر تستی دی کہ قتل جیسے سنگین جرم کی سزا سے بچنے کے لیے کوئی ایک ڈکھ تو جھیلنا ہی پڑے گا۔ میں تفتیش کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ اچانک آگئے اور میں نے مان لیا کہ آپ کے متعلق جو کچھ سنا تھا وہ بالکل صحیح ہے....“

پڑی۔ میں پولیس انسپکٹری میں ہی ریٹائر ہوا۔ مجھے ترقی سے محروم رکھا گیا۔ مجھ سے جنیئر غیر مسلم ایس۔ پی کے عہدے تک پہنچنے۔

میں نے بچے کو خوب داد دی اور اسے اپنی مجبوری بتا کر کہا کہ لڑکی کو میں حراست میں لے لیتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ استغاثہ آنا کمزور رکوں گا کہ لڑکی سیشن سپرد بھی نہیں ہوگی۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ بچے نے کہا۔ ”لڑکی تھانے میں بند ہوئی عدالت میں گئی۔

اخباروں میں اس کا نام چھپا پھر پچھے رہ گیا گیا، ہری ہو بھی گئی تو کوئی اسے قبول کرے گا؟ شریف باپ مرنے نہیں جائے گا؟“

یہاں میں ایک بات کہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آج کے دور کے نوجوان یقیناً ایران ہو رہے ہوں گے کہ ایک پیشہ ور رہنما نے اس قسم کے اخلاق کا مظاہرہ کیا اور وہ ایک عقائد کے ساتھ اس طرح کی باتیں کر رہا تھا۔ آج کی گھبرائی ہوئی نسل شاید اس پر بھی یقین نہ کرے کہ ایک پردہ نشین لڑکی نے ایک غنڈے کو قتل کر دیا تھا۔ میں ان لوگوں کی مجبوری سمجھتا ہوں جو اس واقعہ کو ناقابل یقین سمجھتے ہوں گے۔ یہ لوگ اس دہرے میں پیدا ہوئے ہیں جس میں فیشن اور حسدیت کا اتنا غلبہ ہو گیا ہے کہ عزت اور غربت پر اتنے زمانے کی

پہودہ چیزوں میں شامل ہو گئی ہیں۔ میری عمر کے لوگ جانتے ہیں کہ آج سے تیس پینتیس سال پہلے پیشہ ور ڈاکوؤں اور رہنروں میں بھی رکھ رکھاؤ اور خلوص تھا۔ ڈکیتی اور زہنی کو پیشہ سمجھتے اور جہاں اتنا رکی ضرورت پڑتی وہ جہاں تک کی بازی لگا دیتے تھے۔ زبان کے پکے اور دوستی میں کوئی ہیرا پھیری نہیں کرتے تھے۔ آج کل کے زمانے میں جہاں مذہب کے پردے میں جھوٹ، ماسیارت کے پردے میں جھوٹ، تعلیم کے پردے میں جھوٹ، اپنے پرانے سے جھوٹ، گھر گھر، گلی گلی جھوٹ، دغا اور سرور فریب ہے وہاں لوگ کیسے یقین

اب میری وہ بات سنیں جو میں آپ کے دل میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیں کہ آپ پولیس کے افسر ہیں۔ فرض کریں کہ آپ اس لڑکی کے باپ ہیں۔ فرض کریں آپ پورے بھی ہیں اور شریف بھی۔ آپ کا کوئی بیٹا نہیں۔ آپ کسی غنڈے کے منہ نہیں آسکتے۔ آپ کی بیٹی کے ساتھ کوئی غنڈہ ہی سلوک کرتا ہے جو اس لڑکی کے ساتھ ہوا اور لڑکی اس غنڈے کو قتل کر کے آپ کے پاس آجاتی ہے۔ کیا آپ اپنی بیٹی کو پولیس کے حوالے کر دیں گے؟

مجھے سوچ کر جواب دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ لڑکی نے جسے قتل کیا تھا وہ بدکار تھا، غنڈہ تھا، شریف لڑکیوں کی زندگی تباہ کرنے کا گنہگار تھا۔ لڑکی نے اسے قتل کر کے میری ندرت کو بھی خوش کر دیا تھا مگر میری ایک مجبوری یہ تھی کہ میں پولیس انسپکٹر تھا جس کی نظر میں لڑکی کا جرم یہ تھا کہ اس نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ میرا فرض یہ تھا کہ قاتل کو گرفتار کروں، استغاثہ تیار کروں اور عدالت میں پیش کروں۔ یہ کام قاتل کا ہے کہ وہ ثابت کرے کہ اس نے اشتعال کے زیر اثر قتل کیا ہے یا وہ قتل سے منکر ہو جائے۔

میری دوسری مجبوری یہ تھی کہ میں ڈیوٹی کے معاملے میں دیانت داہ تھا۔ میں نے تین چار مسلمان مازموں کے کیسوں میں انہیں بچانے کے لیے ہیرا پھیری کی تھی لیکن ایسا کبھی نہیں کیا تھا کہ مازم کو گرفتار ہی نہ کیا ہو۔ مازم کو بہر حال پکڑنا اور عدالت میں لے جانا تھا۔ مجھے نوکر ہی بھی کرتی تھی۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں میں پہلے ہی مسلمانوں کی حمایت کا مجرم تھا اور میرے خلاف اوپر انگریز افسروں تک رپورٹیں پہنچانی گئی تھیں لیکن مجھ میں کچھ پیشہ ورانہ اور محکمہ اوصاف تھے جن کی بدولت میں بچا رہا مگر مسلم دوستی کی سزا مجھے ضرور دیکھنی

کریں گے کہ ہمارے وقتوں میں ڈاکو بھی سچ پر قربان ہو جاتا کرتے تھے۔ آج میں وہ باپ اور بھائی دیکھ رہا ہوں جو اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو نئے فیشن میں نیم عریاں کر کے ان کا تعارف اپنے افسروں سے کرتے اور ان کی نمائش کر کے فخر کرتے ہیں کہ وہ ماڈرن ہیں۔ میں آپ کو وہ رہزن دکھا رہا ہوں جو ایک پردہ دار لڑکی کی عورت کی خاطر اپنی جان پیش کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس دور کے جرائم پیشہ لوگوں کا کردار اس لیے بچتہ تھا کہ انہیں سیاسی لیڈروں نے سیاست کے میدان میں سیاسی فنڈز گروہی کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔

میں نے پتلے کی بات سمجھی اور اسے بتایا کہ کہیں رجسٹر ہو چکا ہے، رپورٹ اُور جا چکی ہے۔ قتل شہر میں ہوا ہے۔ دو اخباروں میں خبریں چھپ چکی ہیں۔ دونوں خبروں کے آخر میں لکھا گیا ہے کہ پولیس انسپکٹر احمد یار خان سرگرمی سے تفتیش کر رہا ہے۔ تاحال کوئی بلڈم گرفتار نہیں ہو سکا۔ اُس دور میں آج کی طرح قتل کی وارداتوں کی بھرمار نہیں تھی۔ کہیں قتل کی واردات ہوتی تھی تو سارے ملک کو خبر ہو جاتی تھی۔ میں نے پتلے کو یہ بھی بتایا کہ تیس فیصد مسلوں میں نوکری کر رہا ہوں۔ میرا سے۔ ایس۔ آئی ہندو ہے۔

بلہ شاید میری بات سمجھ گیا تھا۔ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر لولا۔ تیرا آپ پر کوئی زور نہیں۔ میں مجرم ہوں، آپ داروغہ ہیں۔ قتل کا مزم میرے گھر میں ہے۔ آپ کے ساتھ پولیس گی نفری ہے۔ اگر آپ لڑکی کو زبردستی لے جائیں گے تو میں مقابلہ کروں گا۔ میں مارا جاؤں گا۔ شاید آپ بھی مارے جائیں لیکن ساری پولیس نہیں ماری جائے گی۔ لڑکی کو پولیس ضرور لے جائے گی۔ میں خوش تھا کہ مسلمان داروغہ غیرت میں آجائے گا۔

مجھے آج بھی اس کا وہ چہرہ یاد ہے جو کلکتہ چمک اٹھا اور اس نے کہا۔ ”مکدیکہ

میری آنکھ میں آنکھ ڈال کے دیکھ۔ میں گنہگار ہوں اور نیکی کر رہا ہوں۔ ٹونیک ہے مگر نیکی کرنے سے ڈر رہا ہے۔ یہ نوکریاں اس دُنیا میں دھری رہ جائیں گی۔ اُمک، ہمت کر۔ میں تجھے ایک راستہ بتاتا ہوں۔“

اُس نے مجھے ہلا ڈالا۔ ایسی بے تکلفی سے جذباتی رنگ میں بات کی کہ میں نے بے اختیار ہوکہ کہا۔ ”یاں، فٹھے کوئی راستہ بتاؤ۔ میں مان لوں گا۔“

مجھے ہتھکڑی لگا لو۔ اُس نے دونوں ہاتھ آگے کر کے کہا۔ ”اور رکھ لو، بلا قاتل ہے۔ مقدمہ قائم کرو۔ اس میں تھوڑی سی جھوٹ میرے دیکل کے لیے رکھ دو۔ مقدمہ سارا جھوٹا ہو گا۔ لیکن سچا کر کے عدالت میں پیش کرو۔ صرف اتنا کر م کرنا کہ موقعہ کا گواہ کوئی نہ بنانا۔“ وہ ذرا سا چُپ ہو گیا اور پھر بھڑک کر بولا۔ ”بناو مقدمہ۔ پورا بناؤ۔ اپنے اُوپر کچھ نہ لو۔ بلا پاپی پھانسی چڑھ گیا تو کیا قیامت آجائے گی۔ اس سچ کو بچالو۔“

مجھے اندر بیٹھے بہت دیر ہو گئی تھی۔ رگھوناتھ نے ضمن سے مجھے آواز دی۔ اسے بجا طور پر فکر تھا کہ مجھے اندر ہی کسی نے ختم نہ کر دیا ہو۔ میں باہر نکلا اور کچھ سوچے مجھے خبر رگھوناتھ سے کہا۔ ”بھائی میرے یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ قتل بتے نے کیا ہے۔ میں نے ریو اور کنپٹی پر رکھ کر اسے اقبالی کر لیا ہے۔ میں اس کا اور لڑکی کا بیان لے رہا ہوں۔ تم ذرا باہر نظر رکھو۔ یہ کوئی اور ہی چکرتہ ہو۔“

وہ باہر چلا گیا اور میں اپنے ہی منہ سے نکلی ہوئی بات کے چکر میں آ گیا۔ میں نے یہ فقرہ غیر ارادی طور پر کہہ دیا تھا۔ یہ شاید میرے سینے کا مسلمان بول رہا تھا۔ بہر حال میں اپنی سردس کا سب سے بڑا خطرہ مٹول لینے کو تیار ہو گیا۔ اندر جا کر بتے سے کہا۔ ”ٹھیک ہے بتے! ایسے ہی کرتے ہیں جیسے تم نے بتایا ہے۔ لڑکی کو میرے پاس لے آؤ۔ اس

کی باتیں سن کر اگلا قدم اٹھائیں گے۔

وہ اٹھا اور میری ٹھوڑی کو پکڑ کر بولا: "مک صاحب! داروغوں والا حرامی پتا تو نہیں کر رہے؟"

غیر آباد کوٹھی میں چوڑیاں ٹوٹ گئیں

میری ہنسی نکل گئی اور وہ جا کر لڑکی کو لے آیا۔ میں نے جب لڑکی دیکھی تو میں پتے کے کردار کا قائل ہو گیا۔ لڑکی غیر معمولی طور پر خوبصورت تھی اور عمر اٹھارہ انیس سال۔ پتلے سے ٹھیک کہا تھا کہ ایسا قیمتی مال کون واپس کرتا ہے۔ وہ بہت ڈر سی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر پتے کے پیچھے ہونگی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا۔ پتلے نے بھی اسے کہا کہ ڈرو نہیں۔ یہ تمہیں گزانا نہیں کریں گے۔ میں نے اسے سامنے بٹھا کر اور یہ یقین دلا کر کہ اسے آج ہی رات اس کے گھر لے جائیں گے، کہا کہ وہ سارا واقعہ سنا دے۔

اُس نے وہی قعدہ سنایا جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ وہ اپنے بہنوئی کے پاس گئی اور اسے بتایا کہ اس کی بہن کو وہ دکاندار بلیک میل کر رہا ہے مگر یہ وہی آدمی نہ مانا۔ وہ دکاندار کے پاس چلی گئی اور اس کی منت کی کہ وہ اس کے بہنوئی کے دل سے دہم نکال دے مگر وہ اس لڑکی کو پھانسنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ لڑکی اپنی بہن کا رونا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دکاندار کے پاس پھر گئی اور اس کی منت کی۔ دکاندار مقتول نے یہ شرط پیش کی کہ اپنی بہن کی بجائے یہ لڑکی اس کے ساتھ دوستی کر لے، اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کے بہنوئی سے معافی بھی مانگ لے گا اور اس کی بہن کے خلاف یہ جھوٹا الزام دُرور کر دے گا۔ لڑکی جلدی

مگر وہ لڑکی تھی۔ اپنا خون پیتی واپس آگئی۔

ایک روز مقتول نے لڑکی کو راستے میں روک لیا اور اپنی شرط دہرانے کے علاوہ یہ بھی کہا کہ جہاں تمہارا رشتہ طے ہوگا وہاں جا کے کہ دوں گا کہ اس لڑکی کے میرے ساتھ تعلقات ہیں۔ اس لڑکی نے اپنی بہن کو ایک اور واقعہ نہیں سنایا تھا۔ لڑکی اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ بازار گئی۔ سہیلیوں کو کچھ خریدنا تھا وہ اسے ساتھ لے گئی تھیں۔ مقتول کی دکان کے سامنے والی دکان پر سہیلیاں ٹرک گئیں۔ مقتول نے اس لڑکی کو پہچان لیا اور باہر آ کر اسے کہا۔ "میری ایک بات سن کے جانا۔"

لڑکی اس کی دکان میں چلی گئی۔ مقتول نے بڑے پیار سے باتیں کیں اور پھر وہی جال پھینکا۔ لڑکی نے اسے دھتکارا تو مقتول نے کہا۔ "تم کس پر ناز کرتی ہو؟ میں تمہارے گھبرا کر تمہیں اٹھا لاؤں تو تمہارے گھر میں کوئی آدمی نہیں جو مجھے روک سکے۔ تمہارا باپ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ تم لوگوں نے اس کا کیا بگاڑ لیا ہے جس نے تمہاری بہن کو طلاق دیئے بغیر تمہارے حوالے کر دیا ہے؟ میری بات مان جاؤ۔"

لڑکی کو کس پیرسی کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس کے سینے میں ایک شعلہ سا بھڑکا۔ اس نے مقتول سے کہا۔ "مجھے ایک دو دن سوچنے کی مہلت دو۔" اس سے اگلے روز ان کے ہاں مہمان آئے۔ لڑکی پر پاگل پن کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ اس غنڈے کو یہ بتا دوں گی کہ جن بہنوں کے بھائی نہیں ہوتے وہ اپنی عزت مردوں کی طرح بچا سکتی ہیں۔ اُس نے اپنے باپ کو چٹھری سے مرغی ذبح کرتے دیکھا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جیسا کہ اس کی بہن نے مجھے بتایا تھا کہ اس پر خاموشی طاری ہو گئی تھی، وہ ہر لمحہ یہی سوچتی رہی کہ کہاں اور کس طرح انتقام لے۔

احساس نہیں تھا کہ میں پردہ کرنے والی لڑکی ہوں اور نہ مجھے یہ خطرہ تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں اور کیا کرنے جا رہی ہوں۔ آج سوچتی ہوں کہ وہ اپنے ساتھ ایک دو دوستوں کو بھی لے آتا تو میرا کیا محشر ہوتا۔ میں نے کچھ بھی نہیں سوچا۔ جو کرنا تھا وہ میں سوچ چکی تھی۔
مقتول مقررہ جگہ پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ایک ٹانگہ لیا اور لڑکی کو ساتھ بٹھا کر شہر سے باہر لے گیا۔ وہ کوٹھی سے دور ہی ٹانگے سے اترے۔ آگے اذہیرا تھا۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ آگے آگے مقتول کوٹھی کے پھاٹک میں داخل ہوا۔ لڑکی اس کے پیچھے تھی۔ وہ ایک کمرے میں چلے گئے۔ مقتول آگے تھا۔ وہ رُکا اور لڑکی کی طرف گھوما۔ لڑکی نے ناٹ سے چھری نکالی۔ یہ مضبوط چوڑھی اور دس انچ لمبے بلیڈ والی چھری تھی مقتول اس کی طرف گھوما ہی تھا کہ لڑکی نے پوری طاقت سے چھری اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ مقتول اس اچانک وار سے منورسن ہو گیا ہوگا۔ لڑکی نے چھری کھینچ کر دوسرا وار کیا۔ اُس دقت مقتول نے چھری کو بکڑ لیا۔ لڑکی نے زور سے چھری کھینچی۔ مقتول کی سہیلی پر جوگٹ تھا وہ اسی وار کا تھا۔

لڑکی نے قیروا اور کیا اور چھری کھینچ رہی تھی کہ مقتول نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ لڑکی کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ لڑکی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ مقتول واہی تباہی بکتا رہا۔ لڑکی نے کلائی چھڑائی اور چھری پھینک کر باہر کھینچا۔ مقتول نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو ہاتھ لڑکی کے کندھے پر پڑا۔ یہ اُس کا خون سے بھرا ہوا ہاتھ تھا۔ لڑکی اُس کے ہاتھ نہ آئی۔ مقتول دروازے تک اُس کے پیچھے آیا اور وہیں گر پڑا۔ پیٹ اور سینے میں اتنے گہرے زخم کھا کہ وہ کیسے کھڑا رہتا۔ مقتول نے گتے گتے شور مچایا اور بڑی زور سے ہائے ہائے بھی کی۔

اُس نے اپنے انجام کے متعلق بالکل نہیں سوچا۔ اس کے دماغ پر خون سوار ہو گیا تھا۔ اگر وہ کسی کے ساتھ اس سلسلے میں بات کر لیتی تو اس ارادے سے باز آجاتی۔ اس کے ذہن میں لدا پکتا رہا اور ایک روز وہ کسی سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے مقتول کی دکان پر چلی گئی۔ اسے کہا کہ میں تمہارے ساتھ دوستی کروں گی لیکن قسم کھاؤ کہ تم میرے بہنوئی کے دلی سے ہمہری بہن کے خلاف غلط فہمی دور کر دو گے۔

اُس نے ایک کی بجائے دس قسمیں کھائیں اور اسی وقت اسے ایک ہوسٹل کے کمرے میں لے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ لڑکی نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ مقتول نے اسے دو اور جگہیں بتائیں۔ لڑکی نے جو کچھ سوچ رکھا تھا اس کے مطابق یہ جگہیں بھی موزل نہیں تھیں۔ آخر مقتول نے اسے بتایا کہ شہر سے باہر ایک کوٹھی خالی پڑی ہے لیکن وہ صرف رات کے لیے موزوں ہے۔ لڑکی نے اس سے اس کوٹھی کے متعلق بہت کچھ پوچھا اور طے پایا کہ لڑکی شام کے بعد ایک جگہ پہنچ جائے گی۔ مقتول اسے کوٹھی تک لے جائے گا۔

رات ساڑھے آٹھ اور نو بجے کے درمیان لڑکی نے باورچی خانے سے چھری اٹھائی اور شلوار کی ناف میں اڑس لی۔ وہ گھرواؤں سے چوری برقعے کے بغیر گھر سے نکل گئی۔ لڑکی نے ان الفاظ میں بیان دیا۔ ”اس وقت وہ دقت یاد کرتی ہوں تو میرا دل کانپ جاتا ہے لیکن اُس وقت میرے دل میں کوئی ڈر نہیں تھا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس دنیا میں ایک وہ بد بخت دکا نڈا ہے اور دوسری میں ہوں اور مجھے اس آدمی کو ختم کرنا ہے تاکہ دنیا میں اکیلا رہ جاؤں۔ میں جب بازار سے گزری تو دکانیں بند ہو چکی تھیں یا بند ہو رہی تھیں۔ میں مردوں کے درمیان چلی جا رہی تھیں۔ مجھے ذرہ بھر

لڑکی برآمدے میں آئی تو آگے دو آدمی کھڑے تھے۔ لڑکی نے مجھے جو بیان دیا اس کے الفاظ یہ تھے۔ ”میرری ذہنی حالت ایسی تھی کہ ان دو آدمیوں سے مجھے ڈر نہ لگا۔ ایک نے ماچس جلا کر مقبول کو دیکھا اور دوسرے نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں نے انہیں بڑے اطمینان سے کہا کہ میں نے اسے چھری سے مار ڈالا ہے۔ ان آدمیوں نے بڑی اچھی باتیں کیں جن سے میرا دماغ ذرا اپنی جگہ آنے لگا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تم مجھے پولیس کے حوالے کر دو گے؟ ایک نے کہا کہ نہیں، ہمارے ساتھ آؤ ہم تمہیں باہر باہر سے گھر چھوڑ آئیں گے۔ میں ان کے ساتھ چل پڑی۔ مجھ پر کوئی نشہ سا طاری تھا۔ ایک سکون سا تھا جیسے میں نے بڑی لمبی جھانک دوڑ کے بعد اپنا مقصد پایا ہو۔ مگر اچانک میرا دماغ روشن ہو گیا اور میں نے دیکھا کہ یہ آدمی مجھے میرے گھر نہیں بلکہ کسی اور طرف لے جا رہے ہیں میں مرگ گئی۔ تب میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ میں چھری نہیں تھی۔ میں نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے زبردستی کی تو میں بیٹھ گئی۔“

پھر اس نے مجھے بانوؤں میں جکڑ کر کندھے پر اٹھا لیا۔ میں اس پتلے، اکامتا بلکہ کس طرح کر سکتی تھی۔ میں نے دل میں خدا کو پکارا اور خدا سے کہا کہ میں نے ایک بد معاش کو ٹھکانے لگایا ہے۔ ایک گنہگار کو اس کے کیسے کی سزا دی ہے۔ یا خدا! کیا تیرے پاس یہی انصاف ہے کہ غیرت مند لڑکی کو تو دو جنیوں کے حوالے کر دے!..... یہ مجھے یہاں لے آئے۔ مجھ پر غشی بھی طاری ہوئی۔ میں رو رو کر ہلکان بھی ہوتی رہی لیکن اس شخص کو جب میں نے سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ میرا کوئی بھائی نہیں تو اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا، میں تیرا بھائی ہوں اور میں تیرا باپ ہوں۔“

”اس نے ٹھیک کہا تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا ”خدا نے تمہاری دعا سن لی تھی۔ جن

ہنوں کا کوئی بھائی نہیں ہوتا انہیں خدا بھائی دے دیا کرتا ہے۔ یہ رہن بھی تمہارا بھائی ہے اور میں تمہارا بھی تمہارا بھائی ہوں اب یوں کرنا کہ رات کو جب اپنے گھر پہنچو تو گھر والوں کو صرف یہ بتا دینا کہ میں دن کے وقت اگر ساری بات بتاؤں گا۔ تم خود انہیں کوئی بات نہ بتانا۔ زبان کو تاقا بویں رکھنا۔“

خدا اکواہ ہے کہ یہ لڑکی مجھے اس زمین کی مخلوق نہیں لگتی تھی۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ چوم لوں اور اس کے پاؤں میں بیٹھ کر اسے کہوں کہ میرے سر پر ہاتھ پھیرو۔ شاید تمہارے پاک ہاتھ سے اللہ میرے گناہ بخش دے۔

ہیڈ کانسٹیبل اتفاق سے مسلمان تھا۔ میں اس کا افسر تو تھا ہی لیکن وہ مجھے پیروں کی طرح مانتا تھا۔ میں نے اسے بلایا اور کہا۔ ”میں پتلے کو گرفتار کر کے لے جا رہا ہوں۔ ساری نفری اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم یہیں رہ جانا۔ ہم جب دو چار سو گز دور نکل جائیں تو تم اس لڑکی کو ساتھ لے کے چل پڑنا۔ تم اسے تھکانے میں نہیں لاؤ گے۔ اسے اس کے گھر چھوڑ آنا۔ اس کے والد صاحب کو کہنا کہ ملک صاحب کل خود اگر ساری بات بتائیں گے۔ اور تم یاد رکھو کہ لڑکی کو اس کے والدین کے حوالے کر کے بھول جانا کہ تم نے کیا کیا ہے۔ زبان پر ایک لفظ نہ آئے۔ رگھوناتھ کو میں سنبھال لوں گا۔ تمہیں سارا معاملہ کلی سمجھاؤں گا۔“

میں نے پتلے کو ساتھ لیا۔ باہر اگر ساری نفری سمیٹی اور روانہ ہو گئے۔ تھکانے پہنچ کر پتلے کو حوالات میں بند کر دیا۔ کانسٹیبلوں کو چھٹی دے دی اور رگھوناتھ کو اپنے گھر لے گیا۔ اسے اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس واردات میں ایک لڑکی ملوث ہے اور لڑکی پتلے کے پاس ہے۔ اسے سب کچھ پتہ تھا۔ میں نے اسے ساری بات

بتادی۔ اور میں جو ڈرامہ کھیلنے والا تھا وہ اسے سمجھا دیا۔ کچھ بھی نہیں چھپایا اور اسے کہا کہ اتفاق کی بات ہے کہ یہ روٹی میرے مذہب کی ہے۔ اگر وہ ہندو یا سکھ ہوتی تو بھی میں اسے بچانے کی اسی طرح کوشش کرتا اور اسی طرح فخر مول لیتا۔

میں نے رگھوناتھ سے کہا کہ دو باتوں پر غور کرو۔ ایک یہ کہ اس روٹی نے ایک غنڈے اور بڑے ہی کیسے آدمی کو قتل کیا ہے اور اپنی بہن کی اور اپنی عزت کی خاطر قتل کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایک ڈکیت نے اُسے اپنی بیچ لہہ کر مجھے شرم دلانی اور اپنے آپ کو قتل کے الزام میں سزا بھگتے کے لیے پیش کیا ہے۔ میں سارا کیس جتے پر بنا رہا ہوں۔ جو چیزیں برآمد ہوئی ہیں وہ منافع کر رہا ہوں۔ صرت چھری عدالت میں پیش کروں گا کہو میری مدد کر دے؟ تم پر پھر دوسہ کروں؟

مفت کی بوتل اور مرغی دیکھ کر اُس نے تہمت لگایا اور بولا۔ "ملک صاحب! جو کام کل کرنا ہے وہ ابھی کیوں نہ ہو جائے۔ لاؤ، مقدمہ قائم کریں۔" میں اس سے یہی کہنا چاہتا تھا۔ یہ جھوٹا مقدمہ تھا جو میں اسی وقت کھل کر لینا چاہتا تھا اور نہ رات بھر سو نہ سکتا۔ رگھوناتھ کے لیے گلاس اُگیا۔ میں نے جتے کو بھی حوالات سے نکلوا کر پاس بٹھالیا اور ایک گلاس اُس کیلئے بھی منگوالیا۔ میں نے اسے کہا۔ "جئے! یہ مرغی جھٹکے کی ہے۔" اُس نے کہا۔ "ملک صاحب! ہم کون سے حلال کے ہیں۔" اور وہ مرغی کھانے لگا۔

پلاپرانا واردا تیا تھا۔ اگر میں کہوں کہ تفتیش، سراسر غسانی اور مقدمے کی کمزوریوں وغیرہ سے وہ مجھ سے زیادہ واقف تھا تو غلط نہیں ہوگا۔ اُس نے کہا۔ "مقدمہ ایسا قائم کرو جس سے آپ لوگوں پر حرف نہ آئے کہ آپ نے مجھے صرت شک میں پکڑ لیا ہے اور تفتیش میں کوتاہی کی ہے۔ اسے رہنری کی واردات لکھو۔"

یہاں سے میرے ذہن میں ایک لائن آگئی۔ میں نے جئے واردات سے برآمد ہونے والی صرت یہ ایشیا رکھیں۔ چھری، چوڑیوں کے ٹکڑے اور سینڈل کا پاؤں جس کے متعلق کھا کہ واردات کے کمرے سے برآمد ہوا ہے۔ مقتول کی جیب سے ایک سوختیں

میں نے رگھوناتھ سے کہا کہ دو باتوں پر غور کرو۔ ایک یہ کہ اس روٹی نے ایک غنڈے اور بڑے ہی کیسے آدمی کو قتل کیا ہے اور اپنی بہن کی اور اپنی عزت کی خاطر قتل کیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ایک ڈکیت نے اُسے اپنی بیچ لہہ کر مجھے شرم دلانی اور اپنے آپ کو قتل کے الزام میں سزا بھگتے کے لیے پیش کیا ہے۔ میں سارا کیس جتے پر بنا رہا ہوں۔ جو چیزیں برآمد ہوئی ہیں وہ منافع کر رہا ہوں۔ صرت چھری عدالت میں پیش کروں گا کہو میری مدد کر دے؟ تم پر پھر دوسہ کروں؟

مجھے رگھوناتھ کی ایک کمزوری کا علم تھا۔ وہ رشوت لیے بغیر نہیں سکتا تھا۔ تفتیش کے لیے کسی کے گھر جائے تو وہاں اسے جو چیز اچھی لگے اٹھا لانا تھا۔ مجھے اس کی یہ کہوت بالکل پسند نہیں تھی۔ اسی لیے وہ مجھ سے ڈرتا اور بدلتا تھا۔ اب میں نے اسے بتا دیا کہ میں ایک غیر قانونی حرکت کر رہا ہوں تو اُس نے باجھیں کھلا کر کہا۔ "ضرور کہ ملک صاحب! میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میں بھی تو غیر قانونی حرکتیں کرتا رہا ہوں۔ آپ میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔"

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تم جو جی میں آئے کرو، مجھے رشوت سے نہ بھونکا، بس یہی میری شرط ہے۔ میں نے بھی اشارہ دے کر اس کی شرط قبول کر لی۔ میرا مزہ صاف تھا۔ میں ڈیوٹی میں ضرور بددیانتی کر رہا تھا لیکن خدا کی نگاہ میں مجرم نہیں تھا۔

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تم جو جی میں آئے کرو، مجھے رشوت سے نہ بھونکا، بس یہی میری شرط ہے۔ میں نے بھی اشارہ دے کر اس کی شرط قبول کر لی۔ میرا مزہ صاف تھا۔ میں ڈیوٹی میں ضرور بددیانتی کر رہا تھا لیکن خدا کی نگاہ میں مجرم نہیں تھا۔

جس میں ہمدردی اور پناہیت کی جھلک ہوتی ہے، یہ ذہن نشین کرادیا کہ مقتول مجھ اُکھیلے اور ایک عورت کی وجہ سے قتل ہوا ہے۔ پھر ان تینوں کے ذہن اپنے قبضے میں لے کر اس قسم کی شہادت دینے کے لیے تیار کر لیا کہ مقتول بد معاش تھا۔ عورتوں کا نکاسی تھا مجھ کے باز تھا۔ سیوری پر ظلم و تشدد کرتا تھا۔ میں نے انہیں بٹے کا چہرہ اچھی طرح دکھا کر کہا کہ عدالت میں یہ کہیں کہ اس شخص (بٹے) کو انہوں نے کئی بار مقتول کے ساتھ دیکھا تھا۔ پھر میں نے ایک پیشہ ور جھوٹا گواہ پکڑا جسے یہ بیان یاد کرادیا کہ دو دفعہ کی شام اُس نے مقتول کو بٹے کے ساتھ ایک ٹانگے میں شہر سے باہر کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔

بٹے کی ہسٹری شیڈ تو مجھے عدالت میں پیش کرنی ہی تھی۔ اسے میں چھپا نہیں سکتا تھا۔ مقدمے کی اس بنیاد پر میں نے دونوں میں شہادت اور ثبوت کی عمارت کھڑی کرنی۔ یہ ساری شہادت CTDOUNSI ANTI TAL رکھی یعنی اس میں ٹھوس واقعات نہیں تھے اور نہ کوئی موقع کا گواہ۔ میں نے ان سوالوں کا جواب بھی ہتیا کر لیا کہ بٹے کو میں نے کس طرح پکڑا اور اسی کو قاتل کیوں سمجھا۔ میں نے کیس ایسی خوبی سے تیار کیا کہ اوسط درجہ ذہن کا پولیس افسر بھی شک نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ کوئی تجربہ کار پولیس افسر یہ کیس پر طعنا تو میرے کان میں یہ ضرور کہتا۔ ملک صاحب! کتنے ہزار وصول کیے ہیں؟ بٹے کو سارا کیس بتا دیا جس کے مطابق اُس نے صفائی کا بندوبست کر لیا۔

جس رات میں بٹے کو تھانے میں لایا، مجھے ہیڈ کانسٹیبل نے آکر بتایا کہ نہ لڑکی کو اس کے گھر چھوڑ آیا ہے۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ پلٹے چار بجے کیس کا خاکہ بنا کر فارغ ہوا۔ وردی اتاری۔ نہایا۔ اپنے کپڑے پہنے۔ اُس وقت سحر کا دُھند کا ابھی صاف نہیں ہوا تھا۔ میں لڑکی کے گھر چلا گیا۔ وہ سب ابھی سو رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر گھر کے چاروں

روپے برآمد ہوئے تھے۔ گھڑی اور انگوٹھی بھی تھی۔ میں نے یہ دونوں چیزیں شہادت سے نکال دیں اور تین نوٹس دس دس روپے کے، ایک پانچ روپے کا اور ایک روپے کے سات کتے شہادت میں اس طرح شامل کیے کہ یہ رقم خالی کر کے کے اندر بکھری ہوئی ملی ہے۔

سوچتے سوچتے میری نظر شراب کی بوتل پر پڑی جو رکھونا تھا اور پلاپی رہے تھے۔ میں نے شراب کی بوتل اور تین گلاس شہادت میں شامل کر لیے۔ میرا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ خالی کو تھی میں جو اچل رہا تھا اور شراب پی جا رہی تھی۔ اس پارٹی میں ایک عورت بھی تھی جس کی موجودگی چوڑیوں کے ٹکڑوں اور سینڈل کے ایک پاؤں سے ثابت کرنی تھی۔ مجھے خیال آ گیا کہ کو تھی خیر آباد ہے اور وقت رات کا ہے۔ لہذا میں نے برآمد ہونے والی اشیاء میں ایک ادھ جلی موم بتی شامل کر لی۔

وہ رہزن تھا، میں پولیس انسپکٹر مگر ایک لڑکی کی خاطر.....

غرض ہم کیس تیار کرتے رہے۔ رکھونا تھانے نشے میں اور بٹے نے ہوش قائم رکھ کر نہایت اچھے مشورے دیئے اور جب ہمارا کیس مکمل ہو گیا تو صبح کے پونے چار بج چکے تھے۔ یہ تفصیلات چونکہ تکنیکی ہیں اس لیے آپ کو سنانا بے معنی ہے۔ آپ بورجوں گے۔ آپ کو مختصر سی بات سنا دیتا ہوں۔ میں نے قتل کا باعث جو، عورت اور شراب رکھا۔ اسے تقویت دینے کے لیے میں نے دوسرے دن مقتول کی بیوی اور بیوی کے دونوں بھائیوں کو بلایا۔ یہ تینوں پہلے ہی مقتول سے نالاں تھے۔ میں نے انہیں پولیس والوں کی مخصوص اُستادی سے

مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس لڑکی کی گمشدگی اور اٹھ دنوں کی غیر معاضری کا محنتے میں کوئی چرچا نہیں ہوا۔ گھروالوں نے بڑی خوبی سے پردہ ڈالے رکھا تھا۔ لہذا اُس کا رشتہ جو طے ہو چکا تھا وہ محفوظ رہا۔

اب میرا امتحان باقی تھا۔ کیس کو رٹ میں جا رہا تھا۔ میں نے چالان پیش کر دیا۔ حالات میں پتلے کی میں نے خوب خاطر تواضع کی۔ پتلے نے کورٹ میں جرم سے انکار کر دیا۔ پھر مقدمہ چلا۔ گواہ بھگتے۔ شہادتیں پیش ہوئیں۔ پتلے کی ہسٹری شیٹ پیش ہوئی۔ دن گزرتے رہے اور آخر کیس سیشن سپرو ہو گیا۔ سیشن جج ایک انگریز تھا۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ انگریز غیر معمولی طور پر قابل ہوتے تھے۔ ان کی قابلیت یہ تھی کہ بادشاہ تھے۔ سیاہ اور سفید کے مالک تھے۔ البتہ اللہ میں خوبی یہ تھی کہ اپنے فرائض کے معاملے میں دیانت دار اور محنتی تھے۔ ہمارے افسروں کی طرح افسری کا ناجائز استعمال نہیں کرتے تھے۔ لیکن کبھی آپ کو ایک ایسے انگریز پولیس افسر کی کہانی سناؤں گا جس نے دو ہزار روپے رشوت قبول کر کے اور کیس میں ثبوت ایک دیہاتی نوجوان لڑکی کو دو تین روز اپنے پاس رکھ کر میرا ایک کیس چھپٹ کر دیا تھا۔

پتلے کا کیس انگریز سیشن جج کے پاس گیا۔ پتلے کا وکیل کچھ تیز تھا اور کچھ میرا استغاثہ کمزور تھا جس سے وہ نہایت قابلیت سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ دیر یا در ہے کہ بلا اب جیل میں حوالاتی تھا۔ میں اس کے لیے پھل فروٹ اور ضرورت کی دیگر اشیا رکھی کے ہاتھ جیل میں بھیجتا رہتا تھا۔

اس انگریز سیشن جج نے پتلے کی ہسٹری شیٹ کو سامنے رکھا اور اسی بنا پر اسے چودہ سال سزائے قید یا مشقت سزای۔ اُس نے جو فیصلہ کھا، وہ بہت کمزور تھا۔ مجھے ریضہ دیکھتے ہی یقین ہو گیا تھا کہ بلا اپیل میں بری ہو جائے گا۔ اور ہوا بھی یہی۔ باقی کورٹ

فرد میرے گرد جمع ہو گئے۔ میں کیسے بتاؤں کہ وہ کس قدر ہراساں اور پریشان تھے کسی کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی اور وہ مجھے اپنا محافظ سمجھ رہے تھے۔

میں نے لڑکی کے والدین کو اس کے سامنے سارا واقعہ سنا دیا۔ انہیں تسلی دی۔ حوصلہ بڑھایا اور انہیں سختی سے کہا کہ اس واقعہ کے متعلق زبانیں بند رکھیں۔ اُس وقت لڑکی کی ماں نے بتایا کہ اُن کے باپ تین دن قرآن خوانی ہوتی رہی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ اب میرے لیے بھی دعا کریں کیونکہ میں اپنی ساکھ اور اپنی نوکری کو خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ میں باپ کے تاثرات الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسے تاثرات صرف دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ میں حجب وہاں سے چلنے لگا تو لڑکی کی ماں نے مجھے گلے لگا لیا۔ بہت دیر گلے لگائے رکھا اور ہچکیاں لے لے کے روتی رہی۔ میں نے انہیں یقین دلادیا تھا کہ لڑکی جس طرح پاک صاف گھر سے نکلی تھی اسی طرح پاک صاف واپس آئی ہے۔

تین چار روز بعد مقدمے کی کاغذی کارروائی سے فارغ ہو کر میں نے اس لڑکی کے بہنوئی کو اور بیٹی کو لڑکی کے گھر آنے کو کہا اور مقررہ وقت پر پہنچ گیا۔ ان دنوں کو یہ نہیں بتایا کہ مقتول کو اس لڑکی نے قتل کیا ہے بلکہ یہ بتایا کہ وہ بدکار جو اُٹھیلے تاثرات پیتے اور ایک عورت کو ساتھ لیے ہوئے ایک عادی مجرم کے ہاتھوں قتل ہوا ہے۔ پھر بیٹی اور اس لڑکی کی زبانیں اس کا وہم دُور کیا۔ اس کی بیوی کو میں نے کہا کہ اسے اُس رتھے کے متعلق بھی پتا نہ۔ اور یہ بھی بتاؤ کہ تم مقتول کے گھر اور اس کی دکان پر کیوں گئی تھیں۔ اُس نے بتا دیا۔ اور اس کا وہم دُور ہو گیا۔ میں نے اس پر تھا نیداری کا رعب بھی جھاڑ دیا تاکہ اُس کا داغ درست رہے اور اسے شرم بھی دلائی کہ اس کا فرض یہ تھا کہ ایسی نیک بیوی اور ایسے بھلے مانس مسسراں کی عزت کا تحفظ کرتا۔ بہر حال وہ نام نہاد ہو کر اپنی بیوی کو لے گیا۔

میں اپیل دائر ہوئی تو دوسری ہی پیشی میں منظور ہو گئی۔ بتے کو پائی کورٹ۔ نہ شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا۔ اسی شام جیل سے رہا ہو کر بلا مجھے ملنے آیا۔ میں نے اسے ایک جگہ بتا کر کہا کہ شام کے بعد وہاں میرا انتظار کرنا، میں تمہیں اس لڑکی کے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔ یقین کیجئے، بتے نے کہا۔ نہ ملک صاحب! میں ناپاک آدمی ہوں۔ اس گھر میں میرا سایہ نہ لے جاؤ۔“ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور چلا گیا۔

میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ رہزن تھا۔ ڈکیت تھا۔ بردہ فروش تھا۔ یہی اس کی ہسٹری شیٹ میں لکھا تھا مگر اس کے سینے کی تحریر کچھ اور تھی۔ وہ صرف میں نے اور رگھوناتھ نے پڑھی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا اور جب وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

بھگوان کے بعد تم ہو

نقب زنی کی ایک واردات چھے کانگریسی لیڈروں نے سیاسی مسئلہ بنا دیا — ہندو لڑکی نے اپنے کانگریسی باپ کو ایک مسلمان لڑکی کی خاطر عدالت میں بے نقاب کر دیا۔

نے جگایا اور بتایا کہ نقب زنی کی ایک رپورٹ آئی ہے۔

میں دفتر میں گیا۔ رپورٹ دینے والا ایک ہندو سینٹر تھا۔ شہر کے بڑے بڑے سینٹروں، سیاسی اور مذہبی لیڈروں، جرائم پیشہ افراد اور دیگر غنڈوں وغیرہ سے پوری طرح آگاہ ہوا میں۔ ایرج - اولیٰ یعنی تھانے کے الیکٹرانچارج کے لیے سید ضروری ہوتا ہے۔ میں ابھی ان لوگوں سے واقف نہیں ہوا تھا کیونکہ اس شہر میں آئے اور تھانے کا چارج لیے ابھی بارہ روز ہی ہوئے تھے۔ کانسٹیبل نے مجھے گھر میں ہی بتا دیا تھا کہ یہ ہندو سینٹر کے چند ایک بہت امیر تاجروں میں سے ہے اور اتر در سوخ والا بھی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اس کے ساتھ ذرا سنبھل کر اور محتاط ہو کر بات کی جائے اور اسے ٹر خانے کی کوشش نہ کی جائے جیسا کہ بعض تھانیدار کیا کرتے تھے۔

نقب زنی کے متعلق محمود علی سی تشریح ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ نقب کا بالکل رواج نہیں رہا۔ اب تو دن و رات سے اسے ٹوٹتے ہیں۔ راتوں کو چور اچکے دلیار میں چھانڈ کر اندر چلے جاتے ہیں اور جو ہاتھ لگے اٹھالے جاتے ہیں۔ پستول دکھا کر بنگ لوٹ لیے جاتے ہیں اور ایسی دلیرانہ وارداتیں ہوتی ہیں جیسے اس ملک میں نہ پوئیس ہے نہ قانون۔ ان دلیرانہ وارداتوں سے یہ مطلب لینا غلط ہے کہ ہمارے جرائم پیشہ لوگ دلیر اور جانناز ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ قانون کے محافظ ان کی پشت پناہی کرتے ہیں۔ ان میں بعض سیاسی پارٹیوں کے پالے ہوئے بد معاش ہوتے ہیں جنہیں سیاسی میدان میں مخالفین کے جلسوں، جلسوں میں ہنگامہ کرنے اور مخالفین کو ہراساں کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جب کوئی سیاسی پارٹی اقتدار میں آجاتی ہے تو اس کے غنڈے من مانی کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور انہیں یہ حق دیا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان جرائم پیشہ لوگوں کی پشت پناہی پولیس بھی کرتی ہے لیکن یہ نہ سمجھ لیے کہ پاکستان

نقب زنی کی یہ واردات اور میری تفتیشی یہ روئیدادوں حضرات کے لیے شاید عجیب و غریب ڈرامہ ہو جو پاکستان میں پیدا ہوئے ہیں لیکن ان حضرات کے لیے جو ملک کی تقسیم یعنی اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہندوؤں کے ساتھ رہے ہیں، یہ ڈرامہ حیران کن نہیں ہوگا۔ ہندوؤں کی ذہنیت کو جاننے والے اچھی طرح بتا سکتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد جب مطالبہ پاکستان مشہور ہو چکا تھا، ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہر سطح پر اور ہر شعبے میں نقصان پہنچانے کے لیے کیے کیے ہتھکنڈے استعمال کیے تھے۔ ایک غریب سے مسلمان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے لاکھوں کے لیڈر اسے سیاسی مسئلہ بنا کر ایک محاذ پر متحد ہو جاتے تھے۔

اسی دور میں ہندوستان کے ایک شہر میں ایک امیر کیر مند تاجر کے گھر نقب لگی۔ میں حسب معمول اس شہر کا نام اور کرداروں کے اصلی نام استعمال نہیں کروں گا کیونکہ اس کا مرکزی کردار جو مسلمان تھا وہ پاکستان میں ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کے بیٹوں نے یہاں محنت اور دیانت داری سے باعزت معاشرتی حیثیت حاصل کر لی ہے جس کی بجھے دلی خوشی ہے۔۔۔ سورج طلوع ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی۔ مجھے ایک ہندو کانسٹیبل

لگی دیکھ کر خوف طاری ہو جاتا تھا جیسے یہ انسانوں کی نہیں جنٹوں کی کارستانی ہو۔ نقب ہمیشہ مکان کے پچھوڑے کی دیوار میں لگائی جاتی تھی۔ وہ مکان جن کے پچھوڑے کھلا میدان یا کھیت ہو، نقب کے لیے زیادہ موزوں تھے۔

اس ہندو سیٹھ کا مکان ایسا ہی تھا۔ مکان کیا تھا ایک محل تھا۔ پرانے زمانے کی حویلی تھی۔ پچھوڑے میں میدان تھا جس میں رٹکے ہاکی اور والی بال کھیلا کرتے تھے۔ ایک اکھاڑہ بھی تھا۔ جہاں میدان ختم ہوتا تھا وہاں بارش کے پانی کا قدرتی تالاب تھا۔ اس سے آگے سڑک تھی اور یہ سارا علاقہ شہر کا ایک سرائی یعنی اس سے آگے کوئی آبادی نہیں تھی۔

میں ضرورت کے مطابق اپنا سٹاف ساتھ لے کر ہندو سیٹھ کے ساتھ موقعاً واردات پر پہنچا۔ اس سیٹھ کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ یہ اُس قسم کا ردا تھی بنیا نہیں تھا جو دھوتی اور لمبا کرتہ پہنا کرتے تھے اور ان کے سر پر بودھی ہوتی تھی اور جن کا پیٹ بڑھا ہوا ہوتا تھا۔ یہ ڈاڑن قسم کا سیٹھ تھا۔ آڑھت کی منڈی کا کرتا دھرتا تھا۔ ساہوکارہ بھی کرتا تھا۔ تعلیم یافتہ تھا اور سیاسی میدان کا بھی کھلاڑی تھا۔ اگر وہ ردا تھی بنیا سیٹھ ہوتا تو تھر تھر کانپ رہا ہوتا لیکن یہ ہندو پور سے جوصلے میں تھا۔ اس کے رپورٹ دینے اور باتیں کرنے کے انداز میں حکم کا رنگ تھا۔ دو ایک بار میں نے یہ بھی محسوس کیا جیسے وہ مجھے اپنا نوکر سمجھتا ہے۔

میں اُس کے مکان کے پچھوڑے پہنچا تو صبح کی روشنی سفید ہو چکی تھی اور آتشانی میرے لیے یہ شکل پیدا کر چکے تھے کہ انہوں نے نقب نزن کے گھر سے اپنے پادوں تلے مسل ڈالے تھے۔ بہت سی اشیاء دیوار سے سڑک تک بکھری ہوئی تھیں لہذا آتشانی بھی دیوار سے سڑک تک (دفاصلہ ساڑھے چار سو گز) یوں گھوم پھر رہے تھے جیسے نمائش کے محفل۔ مثال

جیسے سیاسی اور سرکاری نظام میں جہاں کسی وارداتی کی گرفتاری کے ساتھ ہی اوپر سے ایک ٹیلیفون آجائے کہ ملک صاحب خیال رکھنا۔ یہ اپنا آدمی ہے۔ وہاں پولیس آفیسر قانون اور تحفظ نامہ کی بجائے اپنی نوکری اور ترقی کا زیادہ فکر کرتے ہیں۔

جہاں قانون شکنی کی اتنی نیشیت پناہی حاصل ہو جائے وہاں کسی کو نقب لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ انگریزوں کی حکومت میں ایسی کھی چھی نہ جرائم پیشہ لوگوں کو تھی نہ پولیس کو۔ میرا پھیری پھر بھی ہوتی تھی۔ رشوت بھی لی دی جاتی تھی لیکن یہ حال نہیں تھا کہ سارا نظام ہی میرا پھیری اور رشوت پر چل رہا ہو اور لوگ قانون کو ہی خرید لیں۔ میں نے پورن کے ساتھ تھانید اردن کو بھی دس دس سال کے لیے قید ہوتے دیکھا ہے۔

اُس وقت واردات اس طرح کی جاتی تھی کہ سرائی اور گھر اندر داخلے۔ پولیس قسم کھا کے نکلتی تھی کہ سرائی لگا کے دم لیں گے۔ ایسی صورت حال میں نقب زنی ڈاکے کا ذریعہ تھی۔ ڈاکو کسی مکان کے پچھوڑے کی دیوار صرت اتنی سی چھا ڈاکرتے تھے جہاں سے ایک آدمی پیٹ کے بل رینگ کر اندر جا سکے اور جہاں سے عام سائز کا ٹمک باہر نکالا جا سکے۔ نقب زنی کی وارداتیں گرمیوں میں ہوتی تھیں جب لوگ چھتوں پر یا صحن میں سوتے تھے۔ اس کے لیے زیادہ موزوں مہینے مارچ، اپریل اور اکتوبر کے ہوتے تھے کیونکہ اس موسم میں لوگ چھتوں کی بجائے صحن میں سوتے تھے۔

پچھلی دیوار کی اینٹیں ایک آہنی سلاخ سے جسے سببا کہتے ہیں ایسی استاد ہی سے نکالی جاتی تھیں کہ گھر والوں کو ذرا سی بھی آہٹ نہیں سنائی دیتی تھی۔ بے حد مضبوط دیواروں میں سے لہٹیں نکال لی جاتی تھیں۔ پھر مجرم اندر جا کر ٹمک اور سوٹ کیس باہر لاکر قابض ہو جاتے تھے۔ نقب زنی استادوں کا ایک فن تھا۔ ہر کوئی نقب نہیں لگا سکتا تھا۔ نقب

دیکھ رہے ہوں۔ میرے کانٹیلوں نے انہیں وہاں سے ہٹا دیا لیکن بیکار تھا۔ گھر سے ختم ہو چکے تھے۔

بھگوان کی آنکھ لگ گئی تھی

میں نے اندر جا کر دیکھا۔ بس کمرے کی دیوار میں نقب لگائی گئی تھی، اس کے دائیں، بائیں اور آگے تین کمرے تھے، نقب والا کمرہ عبادت کا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک چوڑا سا تھا۔ اس پر بھگوان اور اس کی دو دیویوں کی مورتیاں تھیں۔ ان کے نکلے میں مصنوعی مار پڑے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے قالین پکھا ہوا تھا۔ دو دیواروں کے ساتھ صوفوں کی طرح بید کی لمبی اور چھوٹی کرسیاں تھیں۔ دیواروں کے ساتھ مذہبی تصویریں آویزاں تھیں۔ نقب بھگوان کے دائیں پہلو کے ساتھ لگائی گئی تھی۔ اس وقت شاید بھگوان کی بھی آنکھ لگ گئی تھی۔

دائیں طرف والے کمرے میں ٹرنک، بیٹیاں اور سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔ اسی کمرے میں سے سامان چوری ہوا تھا۔ دو ٹرنک اور ایک ایچی کیس غائب تھے۔ ایک ٹرنک دو ٹرنکوں کے نیچے سے لٹکا لگیا۔ اوپر والے دونوں ٹرنکوں کو نقب زن الگ رکھ گئے تھے تین ایچی کیس تھے جن میں سے صرف ایک اٹھایا گیا تھا۔ دونوں ٹرنک اور ایچی کیس خالی تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کسی گھر کے بھیدی کا کام ہے۔ اس نے وہی ٹرنک اٹھوائے تھے جن میں نقدی، زیورات اور قیمتی کپڑے تھے۔ کرنسی کی شکل میں نقدی چھتیس ہزار تھی اور زیورات تیس ہزار کی مالیت کے تھے۔ کپڑے بریشمی تھے۔ باقی کمروں میں کسی چیز کو بالکل نہیں چھڑایا گیا تھا۔

باہر کا منظر یہ تھا کہ مکان کے پھوپڑے سے پچاس گز دور ایک ٹرنک کھلا پڑا تھا۔ اس کا تالا بہت مضبوط تھا لیکن بڑی صفائی سے توڑا گیا تھا۔ کچھ کپڑے اس کے اندر رکھے ہوئے تھے اور کچھ باہر بکھرے ہوئے تھے۔ دوسرا ٹرنک میدان کے کنارے پر، تالاب کے قریب پڑا تھا۔ اس کا تالا زیادہ مضبوط اور پیچیدہ تھا۔ لہذا ڈھکنے کے پیچھے والی سلاح نکال کر

میں نے نقب کو غور سے دیکھا۔ یہ کسی استاد کا کام تھا۔ اینٹیں استاد کی طریقے سے نکالی گئی تھیں۔ نقب زمین کے ساتھ لگی تھی۔ سوراخ پورے تین فٹ اور اٹھائی فٹ تھا۔ اس کے قریب جو گھر سے تھے وہ گڈڈتے کیونکہ مجرموں نے وہاں بیٹھ کر دیوار توڑی تھی اور پھر اس جگہ سے تماشائیوں نے گھر سے منٹائیے تھے۔ میں نے اپنی عبادت اور اپنے طریقہ کار کے مطابق دیوار کے سوراخ کو در زمین کو بہت ہی غور سے دیکھا۔ میں نے آپ کو اپنی کہانیوں میں سنایا ہے کہ موقعہ واردات کو اگر تعانیدار گہری نظر سے دیکھے اور گھاس کے ٹوٹے ہوئے تنکے کو بھی نظر انداز نہ کرے تو کوئی نہ کوئی سراخ اسے مل ہی جاتا ہے خواہ وہ کسی انسان کا دو سو تر لمبا بال ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ اس کے لیے گہری نظر اور تیز دماغ کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ مٹی پتھر اور اینٹیں بولا نہیں کرتیں، ان کی خاموش زبان کو سمجھنا پڑتا ہے۔

میں نے غور سے دیکھا تو مجھے زمین پر ایک چیز نظر آئی۔ میں نے اسے اٹھا کر سوگھا پھر چھٹی ہوئی دیوار میں جھانکا۔ یہ چیز ایک بگ فٹ آگتی۔ میں نے اپنے لے۔ اس میں کوئی چیز دے کر کہا۔ فوراً تم نے جا۔ اس کا پا۔ سن بناؤ اور ڈاک کے ذریعے نہیں بلکہ کسی کانٹیل کے ہاتھ کی مکمل ایکڈ امیز کو بھیج دو۔ ایک پینٹریٹن سواد اس بجے کوڑتی تھی۔ میں نے اسے اس آئی کو مکمل ہدایات دے دیں کہ وہ اس کے ساتھ چھٹی میں کیا کئے اور اسے کہا کہ کانٹیل کو سواد سن بے کی گاڑی سے بھیج دو۔ اسے چالیس میل دور جانا تھا۔

سانز کی فوٹو الگ تھی۔ یہ ایک جوان آدمی کی فوٹو تھی۔ میں نے دونوں تصویریں عجیب میں ڈال
 لیں۔ پھر میں نے دونوں ٹرانوں کو اچھی طرح دیکھا۔ اس دوران میرا ذہن خود کار مشین کی
 طرح سوچتا رہا کہ یہ واردات کس کی ہو سکتی ہے۔

ذہن بار بار اُن نامی گرامی ڈاکوؤں کی طرت جاتا تھا جو جنگلوں اور ہیا بانوں میں سے
 گزرنے والی شاہراہوں پر بڑے پیمانے کی رہزنی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ دو گز رہوں کی
 صورت میں قبضوں اور دیہات میں ڈاکے ڈالا کرتے تھے۔ یہ ڈاکو نقتب کم ہی لگایا کرتے
 تھے۔ وہ دیر نوگ تھے۔ پولیس کا باقاعدہ مقابلہ کرتے تھے۔ انگریز بھی ان کے ہاتھوں پر نشان ہر
 گئے تھے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں ایسے ڈاکو بھی تھے جو جیلینج کر کے آیا کرتے تھے۔ یہ
 تھانے کے علاقے میں ایسے دو اشتهاری ڈاکو تھے۔ ان میں پر بت نام کا ڈاکو زیادہ خطرناک
 تھا۔ وہ قتل کی گیارہ، گاڈا کے کی سترہ، راہزنی کی بارہ اور اغوا کی پانچ وارداتوں میں مطلوب تھا۔
 دوسرا ڈاکو نرسنگھ مونا تھا۔ یہ داڑھی اور سر کے بالوں کے بغیر کھتا اس لیے
 اسے مونا کہتے تھے۔ وہ بھی قتل، دکیتی، رہزنی، اغوا اور گرفتاری سے بچنے کی مساع کو شش
 کی بہت سی وارداتوں میں مطلوب تھا۔ پر بت اور نرسنگھ مونا کے طریقہ واردات میں
 نقتب زنی شامل نہیں تھی۔ نقتب زنی میں مجرموں کے مجز یا گھکے بھیدی کا دہرہ ضروری
 ہوتا ہے۔ اس ہندو سیٹھ کا بھی کوئی گھر بھیدی تھا جو اس کا اپنا نوکر ہی ہو سکتا تھا۔
 اسے کپڑا کر دے معاف گواہ بنانے سے میری تفتیش ختم ہو سکتی تھی۔

میں نے سڑک سے آگے گھرا اٹھانے کے لیے دو ماہر کھوجی بھیجے اور اپنے دیہاتی
 مجروں کو بھی اس علاقے میں پھیلا دیا جہاں پر بت اور مونسے کے آدمیوں کی موجودگی
 کا شک تھا۔ چوتھے روز میرے ایک مجرنے مجھے یہ اطلاع دی کہ نرسنگھ مونسے کے ایک

اسے کھول گیا تھا۔ اس میں بھی کچھ کپڑے پڑے تھے اور کچھ باہر بکھرے ہوئے تھے۔ چار گز
 دور سونے کے مار کا خانی ڈبہ بڑا تھا۔ اتنا ہی آگے سونے کے کڑوں کی بڑی بڑی بھورت خالی
 ڈبیا پڑی تھی۔ سات گز آگے زور کا ایک اور ڈبہ اور اسی طرح تھوڑے تھوڑے فاصلے
 پر زیورات کے خالی ڈبے ڈبیاں بکھری ہوئی تھیں۔ چند اور اشیا۔ اور عام سے کپڑے
 ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے اور اٹیچی کس غائب تھا۔ ہندو سیٹھ نے بتایا کہ اٹیچی کس چپڑے کا
 تھا اور سائز بڑا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ٹرانوں میں سے قیمتی اشیا نکال کر اٹیچی کس میں
 ڈالی گئی ہیں۔

میں نے یہ اشیا سرسری نظر سے دیکھیں۔ اب میں دیوار سے سڑک تک بکھری ہوئی
 چیزوں اور کپڑوں کو غور سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے ساتھ کوئی
 اور ہو۔ ہندو سیٹھ کو بھی میں وہاں سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ گھر جا کر اُن
 زیورات اور ریشمی کپڑوں کی فہرست بنائے جو چوری ہوئے ہیں اور بیوی سے پوچھ کر یہ
 بھی لکھ لے کہ کپڑوں کے رنگ اور ڈیزائن کیا تھے۔ اسے بیچ کر میں نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ
 تفتیشیوں کو دُور بھگا دیں۔ بعض اوقات مجرم بھی تفتیشیوں میں موجود ہوتے ہیں اور بڑی
 غور سے دیکھتے رہتے ہیں کہ تفتیش کس لائن پر اور کس رخ کو ہو رہی ہے۔ اس سے وہ
 یہ فائدہ اٹھاتے ہیں کہ اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لیتے ہیں۔

لوگوں کو دُور بھا کر میں نے بکھری ہوئی اشیا کو اچھی طرح دیکھا۔ پھر ایک ٹرانک
 کے پاس بیٹھ کر اس میں رکھے ہوئے کپڑوں کو کھول کھول کر دیکھنے لگا۔ ٹرانک کے قریب
 کشیدہ کاری کی ایک کتاب پڑھی تھی۔ اس پر نام لکھا تھا۔ "بلبل" اس کے چند ایک
 ورق اُٹے تو دو تصویریں برآمد ہوئیں۔ ایک ہندو سیٹھ کی فیملی فوٹو اور ایک پاسپورٹ

سے نوکر دوں کی فہرست مانگی۔ اس نے بتایا کہ دکان میں ایک منشی اور چار نوکر ہیں اور ایک ڈوگر گھر میں ہے۔

”آپ کے گھر کے افراد کتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”ان کی عمریں کیا ہیں؟“ بیوی نے۔ ”اس نے بتایا۔ ایک بیٹا، عمر تیرہ سال۔ دوسرا بیٹا، عمر نو سال اور ایک بیٹی، عمر ساڑھے چھ سال۔“

اس کا یہ جواب سن کر میں اس کے منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے میری نظروں سے بچنے کے لیے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا اور جب اس نے میری طرف دیکھا تو میں ابھی تک اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے مجھے شک میں ڈال دیا تھا جیسے وہ گھر کے کسی فرد کو چھپا رہا تھا یا ہو سکتا ہے کہ یہ میرا شک ہی ہو۔

میں نے اُسے دھیمی سی آواز میں کہا۔ ”آپ نے گھر کے تمام افراد مجھے بتا دیئے ہیں؟“

”تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں نے جھوٹ بولا ہے؟“ آدمی ہوشیار اور بار بار غصہ کھنکھنے لگا۔ ”کیا آپ کو یہ شک ہے کہ میرے گھر میں میری اولاد نے ڈاکہ ڈالا ہے؟“

”ابھی میں آپ سے بیسیوں ایسی باتیں پوچھوں گا جن سے آپ سٹنٹا جائیں گے۔ میں نے اسے تحمل سے کہا۔ ”مجھے اس واردات کی تفتیش کرنی ہے جو آپ کے نادان کے بغیر ممکن نہیں۔ مجھے تو ابھی یہ بھی دیکھنا ہے کہ آپ نے زیورات کی انشورنس تو نہیں کرائی؟ اور کیا انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے لیے یہ نصب زنی آپ کا اپنا ہی نام تو نہیں؟“

”ذرا تیز سے بات کرو لیکر!“ اس نے حاکموں کی طرح مجھے ڈانٹ دیا۔

مجھ نے اسے کہا ہے کہ یہ واردات ان کی دمنے کے گروہ کی، نہیں ہے اس لیے ہمارے گھر سے ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہ کرو مرنے نے بھی کہا تھا۔ ”میں جب تمہارے شہر آؤں گا بتا کر آؤں گا۔“ میرے مجھنے مرنے کے مجھ سے پرہت کے متعلق بھی پوچھ لیا تھا۔ اس نے جواب دیا تھا۔ ”تمہارے داروغہ کا دماغ خراب ہے۔ اسے کہو کوئی اور نوکر ہی کرے۔ پرہت چوروں کی طرح نصب نہیں گھایا کرتا۔“

قمیضیں اترادیں

مجھے یقین آگیا۔ یہ پیشہ ور ڈاکو اپنے آپ کو جرائم پیشہ نہیں بلکہ اپنے اپنے علاقے کا بادشاہ سمجھا کرتے تھے۔ ان کا ایک کردار تھا۔ بات تول کر کرتے اور جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ میں نے اُدھر سے توجہ ہٹائی۔ یہاں یہ ذہن میں رکھے کہ قتل کوئی بھی آدمی کر سکتا ہے، ایسے انسان بھی قتل کر ڈالتے ہیں جنہوں نے کبھی کبھی بھی نہیں ماری۔ یہ فروری اشتعال اور جذبہ انتقام سے مغلوب ہو جانے کا نتیجہ ہوتا ہے مگر ڈاکہ اور نصب زنی صرف پیشہ وروں کا کام ہوتا ہے۔

ان چار دنوں میں یعنی مرنے کا پیغام آنے سے پہلے میں نے شہر میں اپنی تفتیش جاری رکھی۔ ہندو سیٹھ سے گندہ اشیرا کی مطلوبہ تفصیلات لے لیں۔ واردات سے اگلی رات کانسیٹل جسے میں نے ایگز امینز کے پاس بھیجا تھا، رپورٹ لے کر آگیا۔ میں نے پارسل سنبھال لیا اور اسے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ تمام سزایافتہ اور دیگر رجسٹرڈ مجرمین اور مشتبہ افراد کو اکٹھا کر کے لے آؤ اور دیکھو کہ ان میں کون نہیں ہے اور وہ کہاں ہے۔ اس دوران سیٹھ

اتنا کہا۔ ”میں تم سب کو سوچنے کا موقع دیتا ہوں۔ جادو اور سوچو۔ اس واردات کا جو ملازم خاموشی سے میرے پاس آجائے گا، میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُسے معافی دلا کر سلطان کی گواہ بنا لوں گا۔۔۔ جادو“ وہ سب ہلے گئے۔

میں نے چمے بند کیا تھا اس کے متعلق اپنے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ کل اس ملازم کو سول سرجن کے پاس لے جائے اور اس کے خون کا گروپ اور خون کے متعلق دیگر معلومات کی مکمل رپورٹ لے۔ اے۔ ایس۔ آئی نے بتایا کہ اس شہر میں خون کے اتنے گہرے اور تفصیلی معائنے کا انتظام قابل اعتماد نہیں۔ اسے وہیں لے جانا پڑے گا جہاں پارسل والی بیڑی کا معائنہ کرایا تھا۔ میں نیا تھا۔ مجھے ابھی معلوم نہیں تھا کہ اس شہر میں جو دراصل بڑا قصبہ اور بہت بڑی منڈی تھی، کیا کیا انتظام ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ میں نے اسے سرکاری چھٹی متعلقہ ایکسپرٹ کے نام لکھ دی اور ایک چھٹی وہاں کے پولیس ہیڈ کو ارٹ کے نام لکھی کہ اگر ملازم کو وہاں رات بھر کے لیے رکنا پڑے تو اسے کسی تھانے کی حوالات میں بند کرنے کا انتظام کیا جائے۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے جائے اور ملازم کو شہکارڈی میں لے جائے۔

انگلی صبح میں ہندو سیٹھ کی دکان پر چلا گیا۔ آڑھت کی بہت بڑی دکان تھی۔ سیٹھ باہر کھڑا تھا۔ رسمی طور پر مجھے ملا۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ منشی کب سے آپ کے پاس ہے؟“ بہت عرصے سے ہے۔“

”ایک سال، دو سال، چار سال...“ میں نے پوچھا۔

”مجھے یاد نہیں۔“ اس نے مجھے ٹوک کر جواب دیا اور بولا۔ ”یہ بہت شریف آدمی ہے۔ اس سے کچھ پوچھنا بیکار ہے۔ میرے گھر کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں

ہم نے ہوا، مجھے جانتے نہیں۔ میں گورنر تک پہنچنے والا آدمی ہوں۔“

میں ہنس پڑا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر کہا۔ ”میرے لیے بیکوئی مشکل نہیں کہ میں آپ کو نہیں جانتا۔ البتہ آپ کو یہ مشکل پیش آئے گی کہ آپ مجھے نہیں جانتے۔ میں یکھنت کرسی سے اٹھا اور بچے میں سنجیدگی پیدا کر کے کہا۔ ”آپ تشریح لے چاہتے ہیں... اور اپنے روتے میں بند اور تحمل پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کو زبوراً کی ایک ایک آہٹم اور گندہ رقم کی پائی پائی واپس دلاؤں گا۔ میں گورنر تک پہنچنے والا آدمی نہیں ہوں معمولی سادار وعدہ ہوں لیکن آپ کا یہ وہم دور کر دینا چاہتا ہوں کہ گورنر اپنے قانون کے تحفظ کے لیے آپ کے ساتھ نہیں، صرف میرے ساتھ تعاون کرے گا۔“

وہ چلا گیا اور میں نے اس کے متعلق یہ رائے قائم کر لی کہ آدمی بچتے چلن کا نہیں۔ استاد ہے اور کھلاڑی ہے۔ عام ہندوؤں سے بہت مختلف ہے۔ میں چونکا ہوا گیا۔ شام کے بعد شہر کے جرائم پیشہ اور مشتبہ افراد تھانے پہنچنے لگے۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ سارے شہر میں وہ گل بیابیس تھے جن میں سولہ سزایافتہ تھے۔ کانسٹیبل انہیں لا رہے تھے۔ رات دس بجے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ آخری آدمی بھی آ گیا ہے۔ ان میں سے چھ نہیں تھے۔ کہیں باہر چلے گئے تھے یا روپوش ہو گئے تھے۔ میں نے سب کو دو قطار میں کھڑا کر کے کہا۔ ”قیضیں اتار دو۔“

سب نے قیضیں اتار دیں۔ مجھے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑی۔ انگی قطار میں سے ساتویں آدمی کو میں نے بازو سے پکڑ کر قطار سے الگ کر لیا اور اے۔ ایس۔ آئی سے کہا۔

”اُسے بند کر دو۔“ اُسے اسی وقت حوالات میں بند کر دیا گیا۔

میرا کام بن گیا۔ میرو نے نعت زنی کے ایک ملازم کو پکڑ لیا تھا۔ دوسروں سے صرف

روک دیا اور منشی سے پوچھا۔ ”وہ کتنا عرصہ یہاں رہا اور وہ کیوں اور کہاں چلا گیا ہے؟“
 ”وہ بہت عرصے سے یہاں ملازم تھا۔“ منشی نے جواب دیا۔ ”سیٹھ نے اسے نکال دیا ہے۔“

”کیوں؟“

”یہ تو سیٹھ صاحب ہی بتا سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کوئی گڑ بڑ ہو گئی تھی۔“

”تم سیٹھ کے گھر جایا کرتے ہو؟“

”نہیں جی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ابھی تک نہیں گیا۔“

”پہلا منشی شاید جاتا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں تو معلوم نہیں ہوگا۔“

”ان لوگوں (مزدوروں) سے بتایا تھا کہ وہ سیٹھ کے گھر جایا کرتا تھا۔“

بہن لاپتہ ہو گئی

اتنے میں مین کی بوتل آگئی۔ میں نے پی لی اور سیٹھ سے کہا۔ ”میں آپ کے منشی اور چاروں نوکروں کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

اس نے کہا کہ اس کا کام رُک جانے گا۔ میں نے اسے بتایا کہ میری تفتیش نہیں رُک سکتی۔ اس کے کام رُکتے ہیں تو رُک کے رہیں۔۔۔۔ میں نے اس کی دیل بازی کو نظر انداز کرتے ہوئے منشی اور چاروں نوکروں کو بلایا اور کانسٹیبل سے کہا کہ انہیں تھانے لے چلو۔ مجھے ایک شک تو یہ تھا کہ گھر بھیدی ان نوکروں میں ہی نہ ہو اور دوسرا شک سیٹھ نے بکا کر

ہے۔ میں اس پر ایسا شک نہیں کر سکتا کہ یہ گھر کا بھیدی ہوگا۔ ذرا سی خاموشی کے بعد اس نے مسکرا کر طنز یہ لہجے میں کہا۔ ”صرف ہندو ہے مسلمان نہیں۔“ یہ چوڑھائی میں نے برداشت کرنی۔

منشی مجھے دکان کے دوسرے حصے میں تخت پر بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ میں اس کی طرف چلا تو سیٹھ بھی ساتھ چل پڑا۔ میں رُک گیا اور اسے کہا کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ اس نے پہلے تو ذرا دیر بے سے بات کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ میری اچھلتی میں آئے ہیں۔ میرا ساتھ رہنا ضروری ہے۔“ میں نے جب اکیلا رہنے پر اصرار کیا تو اس نے ٹیکنٹا پنا روٹیہ بدل لیا۔ اپنے ایک ملازم کو اس نے بڑی تیزی سے دس کانٹ دیا اور اسے کہا۔ ”جھاگ کر لین سوڑے کی ایک بوتل لاؤ اور کچھ بھل فروٹ بھی لے آؤ۔“

اس نے مجھے ذرا پرے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھا لیا اور دو ستانہ لہجے میں بولا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں کہ آپ میری اچھلتی میں آئے اور میں نے آپ سے پانی بھی نہیں پوچھا۔“ اس نے اپنے نقصان کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اسے کہا کہ آپ اپنے جس ملازم کو شریف سمجھتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ میری نظر میں مشتبہ ہو۔ گھر بھیدی عموماً منشی ہوتا کرتے ہیں۔ میں اٹھا اور منشی کے پاس چلا گیا۔ اس سے صرف یہ سوال پوچھا۔ ”تم یہاں کب سے ہو؟“

”ابھی ڈیڑھ مہینہ بھی نہیں ہوا۔“ اس نے جواب دیا۔

”پہلے کون تھا؟“

”ایک مسلمان منشی تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

اتنے میں سیٹھ بھی میری طرف آیا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے دیں

کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان تھی تو کیا منشی اور سیٹھانی کے خفیہ مراسم تھے؟ کیا اس کی تصویر سیٹھانی نے کشیدہ کاری کی کتاب میں چھپا کے رکھی ہوئی تھی؟

یہ سوال میرے ذہن میں آئے لیکن مجھے دلچسپی صرف اس سوال کے ساتھ تھی، کیا مسلمان منشی گھر کا بھیدی تھا اور یہ نقب زنی اس کی رہنمائی سے ہوتی؟ اس نے سیٹھ کو دھکی دی تھی کہ سیٹھ ہوشیار رہنا۔ دوسری تصویر میں ایک راز تھا۔ وہ میں نے انہیں نہ دکھائی تھی۔ یہ میرا ان خیال تھا کہ اس میں ایک راز ہے۔ یہ میرا دہم بھی ہو سکتا تھا۔ ان ملازموں میں صرف ایک تھا جسے مسلمان منشی کے گھر کا علم تھا۔ چاروں دیہاتی تھے۔ باہر سے آیا کرتے تھے۔ انہیں فارغ کر کے میں اس آبادی میں چلا گیا جہاں بتایا گیا تھا کہ مسلمان منشی رہتا ہے۔ تھوڑی وقت سے مجھے اس کا مکان بلا مار باہر تالا لگا ہوا تھا۔ محلے والوں سے پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ تقریباً پچیس دن گزرے منشی کہیں چلا گیا ہے۔ یہ اس کا اپنا مکان تھا۔ اس میں اس کے والدین، وہ خود اور اس کی ایک چھوٹی بہن رہتی تھی۔ ایک سال گزرا باپ مر گیا اور تین چار ماہ بعد منشی کی ماں بھی مر گئی۔ منشی اور اس کی بہن رہ گئے۔

منشی دس جماعتیں پاس تھا۔ پاس ہوتے ہی اس ہندو سیٹھ کے پاس منشی لگ گیا تھا۔ اس وقت منشی کی عمر پچیس پچیس سال تھی۔ اس کی بہن کی عمر میں بائیس سال تھی۔ بہن کے متعلق مجھے بتایا گیا کہ شریف اور پردہ نشین لڑکی تھی لیکن منشی کا میل جمل شہر کے مشکوک لوگوں کے ساتھ تھا۔ بوجا بھی کھیلتا تھا۔ رعب داب والا آدمی تھا۔ مجھے میں اس نے کبھی بد معاشی نہیں کی تھی نہ ہی اس کے خلاف کسی کو کوئی شکایت تھی۔

ڈیڑھ ایک مہینہ گزرا اس کی بہن کہیں باہر نکلے اور آج تک واپس نہیں آئی۔ میں نے ان کے دست جرح کی۔ کسی ایک نے بھی شک نہ کیا، اظہار نہیں کیا کہ لڑکی اسی

پیدا کر دیا تھا کہ نیا منشی بہت عرصے سے اس کے پاس ہے مگر منشی نے کہا تھا کہ وہ ڈیڑھ مہینے سے یہاں ہے۔ بہر حال سارا معاملہ شک و شبہ پر چل رہا تھا۔ تفتیش بالکل عربی زبان کی طرز ہوتی ہے۔ زیر اور زبر کے فرق سے معان ہی بدل جاتے ہیں۔ میں زبردوں اور زبردوں کے رحم و کرم پر چل رہا تھا۔

سیٹھ کے ان پانچ ملازموں سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ یہ تھیں کہ پہلا منشی مسلمان تھا اور آٹھ سال سے سیٹھ کے پاس تھا۔ وہ سیٹھ کے گھر آیا کرتا تھا۔ شام کے وقت اس کے بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔ سیٹھ کو اس پر بہت بھروسہ تھا۔ اتنا زیادہ کہ پچاس پچاس ہزار کیش بنک میں لے جاتا اور لٹا تھا۔ کوئی ڈیڑھ ایک مہینہ ہوا سیٹھ اور منشی میں کوئی ایسا جھگڑا ہو گیا جس کے متعلق کسی کو معلوم نہیں کیا تھا۔ منشی نے جاتے جاتے سیٹھ کو یہ دھکی دی تھی۔ سیٹھ ہوشیار رہنا۔ اس کے بعد وہ کہیں نظر نہیں آیا۔

مجھے میدان میں بکھرے ہوئے ٹرنکوں وغیرہ کے قریب سے دو تصویریں ملی تھیں جو کشیدہ کاری کی ایک کتاب میں رکھی تھیں۔ میں نے ایک تصویر جو سیٹھ کی فیملی گروپ فوٹو تھی دانستہ سامنے نہ کی۔ دوسری تصویر جو پاسپورٹ سائز تھی، ان ملازموں کو دکھائی۔ سب نے ایک زبان کہا۔ یہ اس منشی کی تصویر ہے۔

اب آپ غور کیجئے کہ مسلمان منشی کی تصویر سیٹھ کے گھر میں رکھے ہوئے ایک ٹرنک میں پڑی تھی اور یہ کشیدہ کاری کی ایک کتاب میں سے برآمد ہوئی۔ یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ کشیدہ کاری کی کتابیں صرف عورتیں اپنے پاس رکھتی ہیں۔ مردوں کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان منشی کا سیٹھ کے گھر میں ضرورت سے زیادہ عمل دخل تھا۔ سیٹھ کی ایک ہی بیٹی تھی جس کی عمر ساڑھے چھ سال تھی۔ سیٹھ کی بیوی

اٹھنا بیٹھا تھا۔ ان کے آنے تک میرے ذہن میں یہ سوال آئے کہ منشی کی بہن غائب ہے، تو بصورت ہے۔ کیا ہندو سیٹھ نے اسے اغوا کر لیا ہوگا؟ شک اس لیے پیدا ہوا تھا کہ منشی سیٹھ کو دھکی دے کر نکلا تھا اور ایک محلے دار سے بھی اس نے کہا تھا کہ اس سیٹھ کو نہیں چھوڑ دوں گا۔ منشی نے اپنی بہن کی گمشدگی کے بعد نوکری چھوڑ دی تھی۔

دوسرا یہ سوال میرے سامنے آیا کہ سیٹھ نے مسلمان کی جگہ ہندو منشی رکھنے کے لیے مسلمان کو نوکری سے نکال دیا ہوگا۔ مسلمان منشی چونکہ غنڈوں بد معاشوں کی منڈلی کا آدمی تھا اس لیے اس نے سیٹھ کو دھکی دی تھی۔ تو کیا سیٹھ کے گھر نقب لگوانا انتقامی کارروائی تھی؟ منشی گھر بھیندی ضرور تھا۔ وہ سیٹھ کے گھر جاتا تھا۔ دو گھنٹے روزانہ اس کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔ اسی لیے بڑے نکال دہی نکالے گئے جن میں مال تھا لیکن کشیدہ کاری کی کتاب سے منشی کی تصویق برآمدگی میرے ذہن میں کچھ اور مشکوک پیدا کر رہی تھی اور پھر ایک یہ شک بھی میرے دل میں آ رہا تھا کہ میں کہیں بلاوجہ مشکوک میں تو نہیں اُلجھ گیا؟

وہ دو آدمی آگے جنہیں میں نے بلوایا تھا۔ یہ دونوں گزشتہ رات بھی آئے تھے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ مسلمان منشی کا ان کے ساتھ میل جول تھا۔ منشی کبھی کبھی جو اٹھتا تھا۔ چوری چکاری کا عادی نہیں تھا۔ اس نے کبھی شراب اور چرس نہیں پی تھی۔ وہ سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا۔ بد معاشوں میں اس کا اثر و رسوخ تھا۔ لٹھ باز اور گھونٹے باز تھا۔ ان دونوں نے یہ افکاشات کیا کہ ہندو سیٹھ کو غنڈوں کی ضرورت رہتی تھی۔ یہ دونوں سیٹھ سے کبھی کبھی پیسے لیتے تھے اور یہ پیسے انہیں منشی کی معرفت ملتے تھے۔ ان دونوں کے علاوہ چار اور انہی کی قماش کے آدمی تھے جو سیٹھ کے اشارے پر ہر کام کو کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان سب میں صرف ایک ہندو تھا باقی سب مسلمان تھے۔

وہی تھی۔ سب کہتے تھے کہ لڑکی غرضت تھی اور بے حد شریف۔ اڈوس پڑوس کی لوکیوں کے سوا اس کا میل جول کسی کے ساتھ نہیں تھا۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ لوگ من گھڑت قصوں سے دوڑیں گے جو بنام کر دیا کرتے ہیں۔ یہ لڑکی گھر سے غائب ہو گئی تھی پھر بھی اس کے محلے والے اس کی تلاش کر رہے تھے۔ یہ ثبوت تھا کہ لڑکی واقعی شریف تھی۔

اس کے جانے کے بعد منشی بہت پریشان رہا۔ بہن کو تلاش کر لیا۔ مگر وہ اسے نہ ملی۔ محلے والوں نے اسے کہا کہ وہ تھانے رپورٹ درج کرادے۔ معلوم نہیں وہ تھانے گیا تھا یا نہیں۔ یہ علاقہ ہندوؤں کی اکثریت کا تھا۔ تجارت اور اعلیٰ حیثیت صرف ہندوؤں کی ملکیت تھی۔ مسلمان کاریء امر دوسری یا انتہائی معمولی قسم کی دکاندار کرتے تھے۔ دس گھروں کے درمیان ایک مسلمان کا گھر تھا۔ لہذا محلے دار منشی کی کوئی مدد نہ کر سکے۔ کوئی پچیس روز گزے منشی بھی کہیں چلا گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔

میرے ارد گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان سے مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات ملنے لگیں۔ مجھے دو مشکوک کردار کے آدمی معلوم ہو گئے جن کے ساتھ منشی کا میل جول تھا۔ میں نے ان لوگوں سے پوچھا کہ جب منشی کی بہن غائب ہوئی تو اس کے بعد اس نے کبھی ہندو سیٹھ کے خلاف بات کی تھی؟

ایک آدمی نے بتایا کہ اس نے ایک روز منشی سے پوچھا تھا کہ بہن کا کچھ پتہ چلا ہے یا نہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر باتوں باتوں میں اس نے ہندو سیٹھ کو گالیاں دی تھیں اور کہا تھا کہ اس ہندو سیٹھ کو نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ سیٹھ کے ساتھ اس کی کیا گڑبڑ ہوئی تھی۔ اس نے سیٹھ کی نوکری چھوڑ دی تھی۔

میں تھانے چلا گیا اور ان دو مشتبہ کردار کے آدمیوں کو بلوایا جن کے ساتھ منشی کا

تھا۔ راز کچھ کچھ کھتا بارہا تھا۔ تصویر کی اُنی طرف ہندی میں ایک فقرہ لکھا تھا۔ میں ہندی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ مجسٹریٹ سے پڑھوایا لکھا تھا۔ بھگوان کے بعد تم ہو۔ تصویر نے مجھے چونکا دیا اور ایسے لگا جیسے میرا بخارا اُتر گیا ہو۔ مجھے خوشی اس پر ہوئی کہ میں غلط لائن پر نہیں جا رہا تھا۔ میں نے تصویر کی برآمدگی کا باقاعدہ مشور نامہ تحریر کیا اور جن دو آدمیوں کو میں نے ساتھ رکھا تھا ان کے دستخط لیے۔

میں نے مکان کے اندر کے دروازے بند کر کے لاکھ سے سز نمبر کر دیئے۔ پھر باہر کے دروازے کے ساتھ اپنا تالا لگا کر سز نمبر کر دیا۔ کانسٹیبل سے کہا کہ ہندو سیٹھ سے جا کے کہو کہ فوراً ہتھانے پہنچے۔ میں تھلنے چلا گیا۔ اسے ایس آئی ملازم کو ضلع ہیڈ کوارٹر میں سے گیا تھا۔ انہیں اگلے روز واپس آنا تھا۔ اب میرا اور سیٹھ کا محرکہ تھا میں اس کے آنے تک دماغ پر زور دے کر سوال سوچتا رہا اور سوالوں کے اشارے کاغذ پر لکھ لیے۔

بملا جوان تھی

سیٹھ آگیا۔ میں نے اُسے احترام سے بٹھایا اور پوچھا۔ ”آپ کے گھر کے افراد کتنے ہیں؟ ان کی تفصیل بتادیں“

”اس سوال کا جواب میں آپ کو دے چکا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ کا فرض ہے کہ ایسی معلومات نوٹ کر لیا کریں“

”نوٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے آپ کا جواب زبانی یاد ہے۔ ایک بیوی، ایک بیٹا، عمر تیرہ سال۔ دوسرا بیٹا، عمر نو سال اور ایک بیٹی، عمر ساڑھے

مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ مسلمان کے ہتھے میں غنڈہ گرد ہی آئی تھی اور وہ ہندو کے راتے کے غنڈے تھے۔ میں نے انہیں دغظ نہیں سنانا نہ ڈرایا دھمکایا۔ میں نے ان میں سے ایک کو اپنے ساتھ رکھا۔ دوسرے کو بھیج دیا۔ یہ ایک بار کا سزا یافتہ تھا۔ اس نے ایک دکان کا تالا توڑا تھا۔ میں نے اسے سیدھے الفاظ میں کہ دیا کہ اگر وہ اور اس کا ساتھی لغت زنی میں شریک تھا تو بول پڑے۔ میں اسے سلائی گواہ بنا لوں گا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس قسم کے جرائم پیشہ افراد کو پولیس انسپیکٹر بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کے انکار کا ایک خاص انداز ہوتا ہے۔ اگر انسپیکٹر ہوشیار ہو تو وہ اس انکار میں سے اقرار کی پوچھ لیتا ہے مگر اس شخص کا انکار صحیح معلوم ہوتا تھا۔ اسے میں نے چار گھنٹے اپنے ساتھ رکھا اور جرح سے بے حال کر دیا۔

یہ آدمی منشی کے متعلق کافی کچھ جانتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ سیٹھ کے ساتھ منشی کی کیا گڑبڑ ہو گئی تھی؟ اس نے کچھ انکشافات کیے مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ منشی کہاں چلا گیا ہے۔ میں نے اس سے چند اور ضروری باتیں پوچھیں اور اسے بھی چھٹی دے دی۔ میں نے منشی کے گھر کی تلاشی ضروری سمجھی۔ قانون کے تقاضے پر اسے کہ میں نے مجسٹریٹ کو اور محکمے کے دو عقل مند قسم کے آدمیوں کو ساتھ لے کر مسلمان منشی کے مکان کا تالا توڑا۔ یہ تین کمروں کا درمیانہ درجے کا مکان تھا۔ عام قسم کا گھر لیسا مان پڑا تھا۔ ٹنک زیادہ نہیں تھے۔

میں نے بڑی احتیاط سے تلاشی لی۔ ایک الماری میں کچھ کپڑے، کتابیں اور کچھ پرانے اخبار رکھے تھے۔ منشی کا ذوق دیکھنے کے لیے میں نے کتابیں دیکھنی شروع کر دیں۔ یہ سب ناول تھے۔ ایک ناول میں سے ایک تصویر گرئی۔ میں نے اٹھائی۔ ایسی تصویر میں پہلے بھی دیکھ چکا

میں نے وہ فیملی گروپ فوٹو اس کے آگے لکھ دی جو مجھے کشیدہ کاری کی کتاب سے ملی تھی۔ اُس نے فوٹو میز سے اٹھانی چاہی لیکن میں نے پیچھے کر لی اور اس فیملی گروپ فوٹو کی ایک اور کاپی اُس کے سامنے رکھ دی۔ یہ مجھے مسلمان منشی کے گھر سے ایک ناول میں سے ملی تھی۔ میں نے سیٹھ کو اس کاپی کی اٹیخ طرف دکھائی۔ ہندی میں لکھا تھا۔ ”جنگل ان کے بعد تم ہو۔“ بلحاظ کشیدہ کاری کی کتاب پر بھی ”بملا“ لکھا ہوا تھا۔

سیٹھ نے سخت چوٹ کھائی مگر سنبھل گیا۔ میں نے اسے ابھی یہ نہیں بتایا تھا کہ اُس کی جوان بیٹی کی کشیدہ کاری کی کتاب میں سے اُس کے مسلمان منشی کی فوٹو بھی نکلی ہے۔

وہ سنبھل کر بولا۔ ”مسٹر احمد یار! میں آپ سے پہلے بھی کد چکا ہوں کہ اپنی فنیشن کو چوری کی اس واردات تک محدود رکھیں۔ میں قانون شاید آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ میرے بیوی بچوں کے ساتھ آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ جوان لڑکی جو گروپ فوٹو میں ہے، میری کچھ گنتی ہے یا نہیں، اس کا دادیات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں جب آپ سے کہوں گا کہ مجھے اس لڑکی پر شک ہے تب آپ مجھ سے پوچھنا کہ یہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔ پھر میں آپ کو اس کے متعلق ساری معلومات دے دوں گا۔“

”آپ نے پہلے منشی کو نوکری سے کیوں نکالا ہے؟ میں نے پوچھا۔

”وہ بے ایمان تھا۔“ اُس نے کہا۔ ”بددیانت تھا۔“

”بددیانتی کی صرف ایک مثال دیجئے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اب یہ احتیاط ضرور کیجئے گا کہ آپ کے منہ سے نکلا ہوا کوئی معنی نلفظ یا الفاظ آپ کے خلاف استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ میں ایک بار پھر پوچھتا ہوں کہ یہ لڑکی کون ہے؟“

”میں نہیں جانتا یہ کون ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میرا گھر ٹٹ گیا ہے اور آپ

پچھ سال“

”دوبارہ یہ سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟“

”ضرورت یہ پیش آئی ہے کہ آپ اپنے خاندان کے ایک اہم فرد کو بھول گئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اگر وہ فرد مر چکا ہے تو اور بات ہے۔“

”آپ مجھ سے سیدھی سیدھی بات کیوں نہیں کرتے۔“ اُس نے شپٹا کر کہا۔ ”آپ

معلوم کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

”سیٹھ صاحب۔“ میں نے بڑے تحمل سے کہا۔ ”میں آپ کو یاد دلا دینا ضروری

سمجھتا ہوں کہ آپ اڑھت کی ایجنسی میں نہیں، تھانے میں بیٹھے ہیں۔ میں آپ کا خادم ہوں، میرا ذمہ بھرا احترام نہ کریں، قانون کا احترام کریں۔ میرا فرض بڑا ہی ناخوشگوار ہے۔ میرے ساتھ تعاون کریں۔“

”بھائی صاحب!۔“ اُس نے کہا۔ ”میں نے آپ کو گھر کے جو افراد بتائے تھے

وہی ہیں۔ ان دو تین دنوں میں میری اولاد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔“

”آپ کے تمام بچے زندہ ہیں؟ میں نے پوچھا۔ کوئی فوت تو نہیں ہوا؟“

”نہیں۔“

”بملا کہاں ہے؟ میں نے آگے ہو کر رازداری سے پوچھا۔

اُس کے چہرے کا اتنا صحت مند رنگ لاش کی طرح ہو گیا۔ وہ تھا تو ہوشیار آدمی لیکن

سورج کو دنیا کی نظروں سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے نہ دیا اور پوچھا۔

”سیٹھ صاحب! آپ کی بیٹی بملا کہاں ہے؟“

”کون بملا؟ اُس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

رٹکیوں کے چکر میں پڑے ہوتے ہیں۔“

”آپ کی بیٹی بلا کہاں ہے؟ میں نے پوچھا۔

”فرض کر لو کہ یہ لڑکی میری بیٹی ہے تو کیا اس نے میرے گھر ڈاکہ ڈلوا یا ہے؟“

”آپ کے گھر میں جو کچھ بھی ہوتا رہا ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں“ میں نے کہا۔

”ڈاکے کے بعد صورت بدل گئی ہے۔ اب اگر آپ اپنی رپورٹ واپس لے میں گے اور کہیں گے

کہ آپ کے گھر قتل نہیں لگی اور کوئی نقصان نہیں ہوا تو مجھ میں اپنی تفتیش مکمل کروں گا۔ اور

سٹو سیٹھ! میں نے ہلکے سے دہرے سے کہا۔“ مجھے ابھی آپ سے ایسے سوال پوچھتے ہیں

کہ آپ کی ساری سوشل حیثیت ایک سینڈ میں ختم ہو جائے گی۔ میں نے ایک مجرم کو گرفتار کر

لیا ہے۔ ہوش میں آؤ سیٹھ۔“

وہ گہرا ہٹ کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ پھر کہنے لگا۔ ”مجھے ذرا سوچنے کی ہمت

دے سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں؟ میں نے کہا۔ آپ ملزم تو نہیں۔ آپ بے شک گھر چلے جائیں۔

اطمینان سے سوچیں۔“ میں نے اُسے حال میں بچانے کے لیے اس کے ذہن سے بوجھ اتار

دینا چاہا اور کہا۔ ”آپ نے کہیں نقب نہیں لگائی بلکہ آپ کے گھر میں نقب لگی ہے۔

مجھے مجرموں کو پکڑنا ہے اور آپ کا مال برآمد کرنا ہے۔“ مجھ سے ایک خلطی ہو گئی۔ میں

نے یہ سوچا کہ اسی دوستانہ لہجے میں اسے دھمکا بھی دیا جائے۔ میں نے کہا۔ ”میں آپ

کو یہ بتا دینا بھی مزدوری سمجھتا ہوں کہ مجھے کچھ ایسے واقعات کا باع ثبوت علم ہوا ہے جو براہ راست

آپ کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ اگر مجھے اپنے دل میں چھپی باتیں بھی بتادیں گے تو

ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔“

یہ صحیح ہے کہ میں نے اس پر پھینکنے کے لیے دوہم رکھے ہوئے تھے مگر مجھے یہ اشارہ

نہیں دینا چاہیے تھا جو میرے منہ سے نکل گیا تھا۔ مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ میں ایسے

آدمی کو دھکی دے رہا ہوں جو میرے خلاف جھلوس بھی نکلوا سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ شام کو صلنے

آگیا۔ میں تھانے میں بیٹھا تھا کہ چھ ہندو آئے۔ ان میں سیٹھ بھی تھا۔ اُس نے تعارف کرایا۔

ان میں ایک اس ضلعے کا کانگریس پارٹی کا صدر تھا اور باقی سیاسی لیڈر اور تاجر تھے۔ اُن

کے ساتھ بہت سی باتیں ہوئیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ وہ مجھ پر یہ الزام عائد کرنے

آئے تھے کہ میں چونکہ مسلمان ہوں اس لیے میں ایک ہندو سیاسی لیڈر سیٹھ کو پریشان

کر رہا ہوں۔ میں نے اُن سے بہت بحث کی لیکن ان کا لب و لہجہ اور دوتیہ تو میں امیر تھا۔

انہوں نے میری تفتیش کو ہندو مسلم مسئلہ بنا دیا۔

کانگریس کے ضلعی صدر نے کہا۔ ”آپ اس شہر میں جمانے کہاں سے آئے ہیں۔ آپ

پاکستان کہیں اور جا کر بنائیں۔ یہ ہندوؤں کا شہر ہے۔ اگر آپ سے اس واردات کے

مجرم نہیں پکڑے جاتے تو جواب دے دیں؟“

وہ مجھے مشتعل کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ میں اُنٹی سیدھی باتیں کرگزروں اور

وہ اپنے الزامات صحیح ثابت کر دیں لیکن مجھے اپنے آپ پر پورا قابو تھا۔

ایک ہندو نے کہا۔ ”اُن (سیٹھ) سے ایسے سوال پوچھو جن کا تعلق واردات

سے ہے؟“

”لا رہی! میں نے کہا۔ ”میں ٹریننگ لے کر تھا نیدر بنا تھا۔ مجھے مزید ٹریننگ

کی ضرورت نہیں۔ میں وہ سوال پوچھوں گا جو میں بہتر سمجھوں گا۔ میں جو کچھ پوچھنا چاہوں گا

وہ میں ضرور پوچھوں گا۔“

اگر وہ دفتر میں نہ ہوں تو ان کے گھر کا نمبر ملوادو۔ یہ ایس پی انگریز تھا۔ ایک دیسی تھانڈر کی ایک انگریز ایس پی کے سامنے حیثیت دہی تھی جو پاکستان کے وزیر اعظم کے سامنے کسی پرائیویٹ کمپنی کے چیئر پرسن کی ہوتی ہے۔ لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ انگریز اپنے قانون کے تحفظ کے لیے سب کچھ مقبول جاتا ہے۔

ایک بیچ نے تھوڑی سی دیر میں مجھے ایس پی کے پی اے سے ملا دیا۔ وہ بھی انگریز تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ ایک تھانے کا ایس۔ اے۔ او۔ ایس پی سے بات کرنا چاہتا ہے تو اس نے بادشاہوں کے بے بیچ میں پوچھا۔ ”کیا تکلیف ہے تمہیں؟“

میں نے مختصر الفاظ میں اسے نقب زنی کی واردات کے متعلق بتایا اور شکایت یہ کی کہ یہاں کے کانگریسی لیڈر مجھے تھانے میں آکر دھمکیاں دے گئے ہیں۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ اس واردات کے اندر بھی ایک واردات ہے۔ میں صرف یہ حکم لینا چاہتا ہوں کہ میں ان کانگریسی ہندوؤں کو خوش کروں یا شہنشاہ برطانیہ کے قانون کو۔

انگریز کو اپنی بات پر لانے کے لیے میں نے شہنشاہ برطانیہ پر زیادہ زور دیا۔ پی اے نے کوئی اور سوال کیے بغیر مجھے ایس پی سے ملا دیا۔ اس کا نام اے سی کمبل تھا۔ اُسے پولیس کے پڑانے اکثر کم ہی جانتے ہوں گے۔ وہ نیانیا انگلینڈ سے آیا تھا۔ سنا تھا کہ پندرہ سال پہلے وہ انگریز کے عہدے سے ہندوستان میں رہ چکا تھا۔ اُردو بہت اچھی بولتا تھا۔ اس میں خرابی یہ تھی کہ ہندوستانیوں سے سخت نفرت کرتا تھا اور وہ تشدد کا قابل تھا۔ کسی بھی مسلمان، ہندو اور کونسی سیاسی لیڈر کا نام بھی نہیں سنا چاہتا تھا۔ وہ واپس انگلینڈ چلا گیا تھا۔ پندرہ سال بعد وہ لٹل پی کے عہدے سے پھر ہندوستان میں آیا اور اُسے میرے تھانے والا صنایع دیا گیا۔

اب یہاں کے سیاسی حالات کچھ اور تھے۔ جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ انگریز اب ہندوستانیوں

”ہم کشز کے پاس جا رہے ہیں۔“ صدر نے کہا۔ ”آپ ایک ہندو لیڈر کو ہراساں کر رہے ہیں جس کا ایک لاکھ روپے کا نقصان ہو گیا ہے اور آپ انہیں صرف اس لیے ہراساں کر رہے ہیں کہ مجرم مسلمان ہیں۔ آپ انہیں پکڑنا نہیں چاہتے۔“

”آپ کشز کے پاس جاسیے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے ساتھ اور کوئی بات نہیں کر دوں گا۔“

انہوں نے آپس میں کھڑے کھڑے اور ایک نے ٹیلیفون پر ہاتھ رکھ کر دوسروں سے کہا۔ ”میں کشز کے لیے کال نہیں سے بلک کر لیتا ہوں۔“

میں نے ٹیلیفون اپنی طرف گھسیٹ کر کہا۔ ”یہ کانگریس کا دفتر نہیں پولیس سٹیشن ہے۔ جاسیے کسی پرائیویٹ فون پر کال بلک کر لائیے۔“

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ قوم ایک مسلمان کے خلاف کس حد تک بیچ سکتی ہے۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ سیٹھ نے اپنی کڑوت پر پردہ ڈالنے کے لیے ان سب کو استعمال کیا تھا یا یہ سب مجھے ذلیل کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال میں جو کچھ سمجھ سکا وہ یہ تھا کہ اگر میں ان کافروں سے دیک گیا تو میں مسلمان کی حیثیت سے اور پولیس انپکٹر کی حیثیت سے ان کا غلام ہو جاؤں گا اور جیسے جی مرزاؤں گا۔ میں اکیلا تھا۔ جس طرح یہ ہندو لیڈر متحد ہو کر مجھ پر حملہ آور ہوئے تھے اس طرح شہر کے مسلمانوں سے میں اتحاد کی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔ ان کی دہان کوئی پوزیشن نہیں تھی۔ اب مجھ اکیلے کا مقابلہ اتنے سارے ہندو لیڈروں سے تھا۔ وہ مجھے کشز کی دھمکی دے کر چلے گئے۔

میں نے اللہ کا نام لیا اور ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر ایک بیچ کو بلا دیا۔ آپریٹر سے کہا کہ میں تھانہ انچارج احمد یار خان بول رہا ہوں۔ ایس پی صاحب کی کال بلک کر لیکن فوراً ملادو۔

پڑا ہوا ہے۔ اسے اتنا بھی خیال نہیں کہ جس کے گھر ڈاک بڑا ہے وہ کتنا بڑا آدمی ہے اور وہ لاگرس درکنگ کینٹی کا ممبر ہے۔ اسے حکم دیا جائے کہ طریقے سے تفتیش کرے اور شریف اور باحیثیت لوگوں کو بار بار تھانے بلا کر ہراساں نہ کرے۔“

ایس پی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ”وہ ایس۔ ایچ۔ او یہاں سے چلا گیا ہے جو تفتیش میں ٹال مٹول کیا کرتا تھا۔“ میں نے ہندو سیٹھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اُس نے ایک لڑکی کے اغوا کا کیس رجسٹر نہیں کیا تھا کیونکہ وہ لڑکی مسلمان تھی۔“

”تم اُس لڑکی کو چھوڑ دو۔“ ایک ہندو نے کہا۔ ”ہم نقب زنی کے اس کیس کی بات کر رہے ہیں۔“

”میں بھی اسی کیس کی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے وہ بم پھینک دیا جو کسی اور موقع کیلئے رکھا ہوا تھا۔ مجھے مسلمان منشی کا جرائم پیشہ دوست بہت کچھ بتا گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”نقب زنی کے اس کیس کے ساتھ اُس لڑکی کے اغوا کا گہرا تعلق ہے۔“

مجھے ایسی پوری طرح یقین نہیں ہوا تھا کہ مجھے جو اہلامیں ملی ہیں وہ صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ دو تقویوں میں مجھے حوصلہ دے رہی تھیں۔ یہ محض میری خود اعتمادی اور تجربہ تھا کہ میں نے ایک اندام توپ کی طرح داغ دیا۔ میں نے کہا۔ ”جب تک یہ لڑکی برآمد نہیں ہوگی نقب زنی کی واردات کی تفتیش مکمل نہیں ہوگی۔“

”نقب میرے گھر میں لگی ہے۔“ ہندو سیٹھ نے کہا۔ ”میں کسی ایسی لڑکی کو نہیں جانتا جس کا تعلق میرے گھر سے ہو۔“

”آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔“ میں نے اسے کہا اور پھر ایس پی کی طرف دیکھ کر کہا۔

کو فوجی جہتی کی خاطر خوش رکھنا چاہتا تھا۔ مگر کمبل صاحب کا رویہ وہی تھا جو پندرہ سال پہلے تھا۔ وہ صرف چار مہینے ہندوستان میں رہا پھر اسے واپس بھیج دیا گیا تھا۔ میں اُس کی عادت سے واقف تھا۔ اس کے پی اے نے مجھے اس سے ملا دیا تو میں نے اُسے وہی باتیں بتائیں جو اُس کے پی اے کو بتا چکا تھا۔ اُس نے ہندو لیڈروں کو ایک گالی دی اور صرف اتنا کہا۔ ”میں کل آ رہا ہوں۔“

میں نے بم پھینک دیا

دوسرے دن ساڑھے نو بجے وہ اچانک پہنچ گیا۔ مجھے تو یقین نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی آجائے گا۔ میری کرسی پر بیٹھ کر اُس نے کہا۔ ”بہت جلدی جلدی بناؤ کیا معاملہ ہے۔“ میں نے بتا دیا لیکن جو باتیں ابھی چھپا کر رکھی ہوئی تھیں وہ نہ بتائیں۔ یہی بہتر سمجھا۔ اُس نے کہا۔ ”اُن سب کو فوراً بلاؤ۔“ میرا اسے۔ ایس۔ آئی ملزم کو لے کے گیا ہوا تھا میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ میں ابھی ان لیڈروں کے گھروں وغیرہ سے واقف نہیں ہوں انہیں ڈھونڈو اور فوراً تھانے لے آؤ۔ ہیڈ کانسٹیبل پُرانا آدمی تھا میں اس کی پھرتی کی داد دیتا ہوں۔ اس نے نصحت گھنٹے میں پانچوں لیڈروں کو ہندو سیٹھ سمیت تھانے میں اکٹھا کر لیا۔ اپنے سامنے بٹھا کر ایس پی نے اُن سے پوچھا۔ ”تمہیں اس انکپٹر کے خلاف کیا شکایت ہے؟“

نقلے کے کانگریسی صدر نے کہا۔ ”یہ مسلمان ہونے کی وجہ سے ہندو کے نقصان پر خوش ہے۔ تفتیش میں ٹال مٹول کر رہا ہے۔“ جرموں کو پکڑنے کی بجائے لڑکیوں کے چکر میں

میں نے اُسے وہ فوٹو دکھائے جو میدان میں پڑے ہوئے ٹرک کے قریب سے
 کٹیدہ کاری کی کتاب میں سے برآمد ہوئے تھے اور وہ فوٹو بھی مسلمان منشی کے گھر سے نالہ
 سے برآمد ہوا تھا۔ بملا ہند وسیٹھ کی جوان بیٹی تھی۔ منشی کی عمر پچیس چھبیس سال تھی۔ وہ خوب
 اور صحت مند جوان تھا۔ اس کی تصویر بلا نے اپنی کٹیدہ کاری کی کتاب میں رکھی ہوئی تھی۔
 بملا کے پاس اپنی اکیلی شایہ کوئی تصویر نہیں تھی۔ اس نے اپنا فیملی گروپ فوٹو اسے دے
 دیا تھا اور پچھے لکھا تھا ”بھگوان کے بعد تم ہو“۔ اس فقرے کے نیچے بلا نے اپنا نام
 لکھا تھا۔

منشی کے جرائم ہمیشہ دوست کی اطلاع کے مطابق ہند وسیٹھ نے منشی کی بہن کو اغوا کر دیا
 تھا۔ ادھر بملا لاپتہ تھی جسے ظاہر ہے کہ منشی لے گیا تھا۔ میرے شبکوک کے مطابق نقب زنی اس
 منشی نے کروائی تھی اور یہ انتقامی کارروائی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ اس واردات میں بملا کبھی
 ہاتھ تھمایا نہیں اور میں نے معلومات اور شبکوک کو اینٹوں کی طرح جوڑ کر جو عمارت بنائی تھی وہ
 کتنی کچھ مضبوط تھی۔ میں نے یہ ساری شہادت ایس پی کو سنادی اور اسے کہا کہ منشی کی بہن
 برآمد ہونہ ہو مجھے منشی کی تلاش ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ ایک بلزم کو میں نے
 خون کے معائنے کے لیے متعلقہ ایکسپٹ کے پاس بھیجا ہوا ہے۔

اینٹ پر خون

ایس پی دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میرے خلاف ہندوؤں نے جو الزام عائد کئے
 ہیں وہ صحیح تو نہیں؟ میں نے اسے مطمئن کر دیا۔ اُس نے میری حوصلہ افزائی کی اور چلا گیا۔

”جناب ادھر لوکھ س سینڈ نے اغوا کرانی ہے۔ اس سے آپ یہ پوچھیں کہ اس کی اپنی بیٹی کہاں ہے؟“
 سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ میں نے ایک مسلمان کانٹیل اور عیسائی محرز کو بلا لیا۔ میں
 ان سے مسلمان لڑکی کے اغوا کے متعلق کچھ معلومات کی تصدیق کرا چکا تھا۔ یہ میرے یہاں آنے
 سے پہلے کی واردات تھی۔ اس عیسائی محرز سے میں نے کہا کہ صاحب، بہادر کو بتا دو کہ پہلے ایس۔
 ایچ۔ اے نے مسلمان لڑکی کے اغوا کا کیس رجسٹر نہیں کیا تھا۔ اُس نے سنا دیا کہ ایک مسلمان
 یہ رپورٹ دینے آیا تھا کہ اس کی غیر شادی شدہ بہن لاپتہ ہو گئی ہے۔ اُس نے اس ہندو
 سیٹھ پر شک کا اظہار کیا تھا۔ ایس۔ ایچ۔ اے ہندو تھا۔ اس نے اس مسلمان کو پہلے ٹالا پیر
 ڈرایا اور بعد میں یہ کہہ کر تھانے سے نکال دیا کہ تمہاری بہن اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ
 چلی گئی ہے۔

ایس پی نے پوری بات نہ سنی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کیس میں کوئی اور گڑ بڑ ہے۔ اُس
 نے ہندو لیڈروں کو اپنی عادت کے مطابق بڑی بیہوشی سے ڈانٹ کر باہر نکل جانے کو
 کہا۔ وہ سب اٹھ کر باہر کو پہلے تو میں نے ہندو سیٹھ کا بازو پکڑ کر کہا۔ ”آپ ہمیں تشریح
 دکھیں۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔“

میں نے بڑے کانٹیل کو بلا کر کہا کہ سیٹھ صاحب کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور اگلے حکم
 تک اپنے ساتھ ہی رکھو۔ ہیڈ کانٹیل اُسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ ایس پی کے ساتھ ایک
 انگریز انسپکٹر بھی تھا۔ ایس پی نے مجھ سے تھانے کے پہلے تھانیدار کا نام پوچھا کہ اپنے اینٹ
 کو نوٹ کرایا اور حکم لکھو ایا کہ اُسے فوراً محفل کر کے انکو اتری شروع کرا دو۔ ایس پی نے مجھے
 کہا کہ میں اس کے خلاف شہادت تیار کروں۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ لڑکی کے اغوا کا
 نقب زنی کے ساتھ کیا تعلق ہے۔

وہ جتنی دیر میرے متانے میں رہا میرا خون خشک ہوتا رہا۔

اُس کے جاننے کے کچھ وقت بعد میرا اے۔ ایس۔ آئی ملازم کو لے کر واپس آگیا۔ اُس نے اُس کے خون کی بڑی تفصیلی رپورٹ کی ایک نقل مجھے دی۔ میں نے اُسے پہلی رپورٹ سے ملایا۔ خون کا گرہ پ اور دیگر کوائف ایک ہی جیسے تھے۔ اس ملازم کی گرفتاری کی وجہ یہ تھی کہ میں جب ہندو سیٹھ کی رپورٹ پر اُس کے ساتھ موقعاً واردات پر گیا تھا تو میں نے دیوار میں لگی ہوئی نقب یعنی سوراخ کو غور سے دیکھا تھا۔ وہاں مجھے کوئی سراخ نہ ملا۔ سوراخ کے قریب، مجھے اینٹ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آیا جس کی لمبائی تین انچ سے ذرا کم تھی۔ یہ ٹکڑا شکل کا تھا۔ اس کی نوک خنجر کی نوک کی طرح تھی۔ اس نوک پر مجھے سرخی نظر آئی۔ اٹھا کر دیکھا تو شک ہو گیا کہ یہ سرخی خون کی ہو سکتی ہے۔ نوکھا تو جو خون کی ہی محسوس ہوئی۔

ایسی چیزیں جنہیں اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے بڑے کام کی چیزیں ہوتی ہیں۔ انہیں دیکھنے کے لیے گہری نظر چاہیے۔ میں نے یہ ٹکڑا ہاتھ میں لے کر دیوار کے سوراخ کو پھر غور سے دیکھا۔ اینٹیں سالم نکالی گئی تھیں۔ نقب زنی میں اینٹیں سالم ہی نکالی جاتی ہیں لیکن اس واردات میں ایک اینٹ ٹوٹ گئی تھی۔ اگلا حصہ نکلی گیا تھا۔ پچھلا حصہ دیوار میں ہی رہ گیا تھا۔ یہ اس طرح ٹوٹی تھی کہ اس کا جو حصہ دیوار میں رہ گیا تھا اس کی نوکیں بن گئی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چھوٹا سا ٹکڑا لکڑا اس اینٹ کے آگے رکھا تو یہ ایک جگہ فٹ آگیا۔

میں نے دیکھا کہ جب یہ ٹکڑا اینٹ کے ساتھ تھا تو سوراخ کے راستے میں آتا تھا۔ میں نے یہ سوچا کہ پہلا آدمی اس سوراخ سے ریگ کر اندر گیا تو اس نوک نے اس کے کندھے یا بازو کو زخمی کر دیا ہوگا۔ اس کی نوک پر سرخی اسی آدمی کے خون کی ہوگی۔ اُس نے خود یا

اپنے کسی ساتھی سے کہہ کر اس اوزار سے یہ نوک توڑ دی ہوگی جس سے اینٹیں نکالی گئی تھیں۔ اس طرح یہ ٹکڑا سوراخ سے الگ ہو گیا۔ اینٹ چونکہ زمین کے ساتھ تھی اور بہت ہی پُرانی تھی اس لیے اس میں سیم اور نمی تھی۔ نمی کی وجہ سے اینٹ کے ٹکڑے نے خشک اینٹ کی طرح خون چوسا نہیں تھا۔ میں نے اسی وقت یہ ٹکڑا اے۔ ایس۔ آئی کو دے کر اُسے کہا تھا کہ اُسے محفوظ طریقے سے کسی کانسٹیبل کے ہاتھ معائنے اور رپورٹ کے لیے بھیج دو۔

جب اگلے روز رپورٹ آئی تو میرا قیاس صحیح نکلا۔ یہ واقعی خون تھا۔ متعلقہ ماہر نے خون کا گرہ پ اور اس کی کثافت وغیرہ کی رپورٹ کھ دی تھی۔ اس رپورٹ پر میں ایسے آدمی کی تلاش میں تھا جس کے جسم پر تازہ زخم یا ذرا گہری خراش ہو۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ یہ کام پیشہ وردن کا ہے۔ چنانچہ میں نے شہر کے سزا یافتہ اور مشتبه افراد کو جتانے میں بلایا اور سب کو قیضیں اتارنے کو کہا۔

انہوں نے قیضیں اتاریں تو میں نے سب کو ایک نظر دیکھا۔ ایک آدمی کے دائیں کندھے پر جہاں بازو کا جوڑ ہوتا ہے پھیلا چپکا ہوا تھا اور اس پر کراس کی شکل میں چکنے والی شپ لگی ہوئی تھی۔ روٹی اور ٹیپ میلی نہیں تھی جس سے پتہ چلتا تھا کہ ایک آدھ دن سے زیادہ پُرانی نہیں۔ میں نے کسی سوال اور جواب کے بغیر اُسے حوالات میں بند کر دیا۔ پھر اُسے اسی ایگزیمٹر کے پاس اُس کے خون کے ٹیسٹ کے لیے بھیج دیا۔ اس کے خون کے تمام ترکوائف وہی نکلے جو اینٹ کے ٹکڑے پر لگے ہوئے خون کے تھے۔ یہ ثابت ہو گیا کہ اس ٹکڑے پر اسی آدمی کا خون تھا۔

میں نے اسے الگ بٹھالیا۔ اس آدمی کے ریکارڈ پچھانے کے لیے چار مقدمے

کر کے پیٹھ پر رکھ دو، اُفت نہیں کروں گا۔ کوئی سال پانچ دے لو۔ اپنے پیر اُستاد کو بدنام نہیں کروں گا۔ آپ کے پاس ثبوت موجود ہے۔ سلطانی گواہ یا اقبالی بیان کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟ اُس کے لب دہلے میں استادوں والی خود اعتمادی تھی۔ میں نے خاصا دقت لگا کر اُسے گھرنے کی کوشش کی لیکن میری تلقین اور ترغیب کو اُس نے بیکار کر دیا اور ثابت کر دیا کہ اُس کا پیر اُستاد کامل ہے۔ میں نے اسے حوالات میں بند کر دیا۔ اسے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے بتایا کہ یہ آدمی پتھر ہے۔ تشدد اور لاپرواہی کا اس پر ذرہ بھرا اثر نہیں ہوتا۔ مجھے اس کی پچھلی ساری تاریخ سنائی گئی۔

میں نے اسے ساتھ لیا اور اُس کے گھر کی تلاشی لینے کے لیے لے گئے۔ یہ تلاشی صرف کاغذی کارروائی پوری کرنے کے لیے لی جا رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ ایسا منجھا ہوا جرائم پیشہ گھر میں واردات کا کوئی سراغ نہیں رکھے گا۔ اُس کے گھر گئے۔ دریاں اس کی بیوی تھی اور میں بچے۔ بعض جرائم پیشہ افراد کی بیویاں اُن کی کمزوری بن جاتی ہیں کیونکہ وہ اپنے خاندانوں کے پیشے سے نفرت کرتی اور پولیس سے ڈرتی ہیں لیکن اس کی بیوی بھی جرائم پیشہ معلوم ہوتی تھی۔ نچتر کارِ عدالت تھی۔ اُس کی آنکھیں مسکراتی تھیں۔ میں نے اس کے گھر کے برتن بھی اٹے کر دیئے۔ فرسٹوں کو بھی کھٹو لگا کر خاک بھی ماتھہ نہ آئی۔ مجھے یہی توقع تھی۔

ہندو سیٹھ کو میں نے تھانے میں بٹھا رکھا تھا۔ میرا دماغ بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ تلاشی کے بعد میرے دماغ میں ایک سوچ آئی۔ میں نے صرف ایک کانسٹیبل کو ساتھ رکھا اور اسے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ ملزم کو حوالات میں لے جائے اور کاغذات تیار کر کے اس کا رہیمانڈ لے لے۔ میں نئی سوچ کے مطابق ہندو سیٹھ کے گھر چلا گیا۔ سیٹھانی سے ملا وہ سیدھی سا دھی ہندو آئی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ہمدردی کی اور پھر تسلی دلا سہ دے کر کہا

”تھے جن میں سے دو میں عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا تھا اور دو میں اُسے سزا ملی تھی۔ اس کی سب سے پہلے والی واردات نقیب زنی کی تھی جس میں تین افراد گرفتار ہوئے تھے۔ دو کو سزا ہو گئی تھی۔ یہ بیچ گیا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے ذرا کم تھی۔ جسم، زبان اور دماغ پتھر تھا۔ میں نے اس سے کوئی سوال پوچھنے کی بجائے یہ پوچھا۔ ”مقدمہ لٹو گے یا اقبالی بیان دو گے؟“

”میرا جرم کیا ہے حضور؟“

”نقیب زنی۔“

”کہاں؟“

”مجھ پر جرم نہ کرو۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تمہیں کچھ کہے اور پوچھے بغیر گرفتار کیا ہے۔ تم خود اُستاد ہو۔ یہ نہیں سمجھ سکے کہ اس طرح صرف اُسے گرفتار کیا جاتا ہے جس کے خلاف کوئی ثبوت اور شہادت مل جائے۔“

”اگر آپ کے پاس ثبوت اور شہادت ہے تو چالان کاٹھے اور چلئے عدالت میں۔“ یہ آدمی پکا اُستاد تھا۔ اُس کا انداز بنا رہا تھا کہ تشدد برداشت کرنے کا عادی ہے۔

”تم اپنی ہسٹری ٹیٹ سے واقف ہو۔“ میں نے اسے کہا۔ ”عادی مجرم کو عموماً سلطانی گواہ نہیں بنایا جاتا۔ لیکن میں تمہیں سلطانی گواہ بنا لوں گا۔ ظاہر ہے کہ تم اکیلے نہیں تھے۔ تمہارے تمام ساتھی کل تک گرفتار ہو جائیں گے۔ تم مسلمان ہو اور میں بھی مسلمان ہوں۔ مجھ سے فائدہ اٹھاؤ۔“

”داروغہ جی! اُس نے عجیب سی مسکراہٹ سے جس میں شاید طنز بھی تھی، کہا۔ ”عمر اسی پندرہ باسی میں گزر گئی ہے۔ پولیس کی بڑی مار کھائی ہے۔ اب تو توہم کی سلاخ گرم

کی جوان لڑکی بھلائی اُس کے ساتھ تے لکھنی پیدا ہو گئی۔ لڑکی کے ماں باپ نے توجہ نہ دی۔ منشی نے اپنا اعتماد پیدا کر رکھا تھا۔ گھر کے کئی انتظامات اُسی کے سپرد تھے۔ وہ گھر بھیدی بن گیا تھا۔ وہ آٹھ نو سو سال ان کے ساتھ رہا۔ اس عرصے میں اُس نے سیٹھ کی بیٹی کے دل پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔

ڈیڑھ مہینہ گزارا سیٹھ کو پہلی بار شک ہوا۔ اس کے بعد منشی کی حرکات کو چوری چھپے دیکھا جانے لگا۔ سیٹھ نے ایک روز اُسے موقع پر پکڑنے کے لیے کہا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ دن بھر کے لیے باہر جا رہا ہے۔ سیٹھ اور سیٹھانی چھٹی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دوسرے سچے سکول چلے گئے۔ گھر کے نوکر کو شام تک دانستہ چھٹی دے دی گئی۔ بھلا گھر میں ایسی رہ گئی۔ منشی دکان پر تھا۔ سیٹھ اور سیٹھانی کے جانے کے بعد وہ سیٹھ کے گھر چلا گیا۔ سیٹھ اور سیٹھانی سکیم کے مطابق اچانک گھر پہنچے اور منشی کو اپنی بیٹی کے ساتھ نازیبا حرکتیں کرتے پکڑ لیا۔ اس میں اس کی بیٹی کی مرضی شامل تھی۔ سیٹھ اور منشی میں تشریح کلامی ہوئی۔ سیٹھ نے منشی کو دکان پر جانے کو کہا اور اُس کے بعد اپنی بیٹی کو مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ پانچ چھ دنوں بعد سیٹھانی کو پتہ چلا کہ اس مسلمان منشی کو نوکر سے ہٹا دیا گیا ہے۔ اس سے تین روز بعد بیٹی گھر سے غائب ہو گئی۔

سیٹھانی کو اس کے سوا اور کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے اُس سے منشی کی بہن کے متعلق کوئی ذکر نہ کیا۔ میری زبان پر اس کے متعلق ایک سوال اچلا تھا لیکن عقل نے میری مدد کی۔ میں نے ایک اور ترکیب سوچ لی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ سیٹھانی سیٹھ کو بتائے گی کہ میں آیا تھا اور اس کی بیٹی کے متعلق معلومات لے گیا ہوں۔ میں سیٹھ کو اب ایک اور طریقے سے پھانسا چاہتا تھا۔ نقب زنی کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن یہ لڑکی مسلمان تھی اور ہندوؤں کے قبضے

کہ اُن کا سارا مال واپس مل جائے گا۔ اُس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اُس کے دل میں اعتماد پیدا کر لیا۔

”بھلا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا اور اُس کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ دیکھا۔ میں نے پنیر تبدیل کر پوچھا۔ اُس کا کچھ پتہ نہیں چلا کہاں چلی گئی ہے؟ اُس کا سر جھک گیا۔ میں نے ہجے ہیں ہمدردی کا بڑا گہرا رنگ بھر کر کہا۔ آپ غم نہ کریں۔ میں آپ کے پچھلے منشی کو دو دنوں میں زمین کے نیچے سے بھی نکال نالوں گا۔ اُس نے سراٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے اُسے کہا۔ ”سیٹھ صاحب کو چاہیے تھا کہ مجھے پہلے روز ہی یہ بات بتا دیتے۔ انہوں نے آج صبح بتایا ہے کہ آپ کی بیٹی کو وہ نمک حرام منشی ورغلا کر کہیں لے گیا ہے۔۔۔۔۔ آخر یہ بات بنی کیسے؟ منشی کو اتنا موقع مل کیسے گیا تھا؟“

وہ میرے بچہ میں اگئی۔ میرا یہ جھوٹ کام کر گیا کہ سیٹھ نے مجھے بھلا کے متعلق بتا دیا ہے۔ سیٹھانی نے کہا۔ انہوں (سیٹھ) نے مجھے منہ کیا تھا کہ بھلا کے متعلق پولیس کو کچھ نہ بتانا۔ بڑی رسوائی ہوگی۔ اگر نقب زنی کے ملام پکڑے گئے تو عدالت میں بھی لڑکی کا نام آئے گا۔ ساری دنیا سُنے گی۔ مگر انہوں نے خود ہی آپ کو بتا دیا ہے۔“

جوان بیٹی غائب ہو گئی

سیٹھانی نے مجھے بتایا کہ منشی بچوں کو پڑھانے گھر آیا کرتا تھا۔ مسلمان ہونے کے باوجود اُسے یہ لوگ گھر کا فرو سمجھتے تھے۔ وہ زندہ دل اور چالاک آدمی تھا۔ جوان بھی تھا سیٹھ

نے پوچھا۔

”مجھے یہی شک ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے میری بیٹی واپس چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ ڈاکہ اسی مسلمان منشی نے ڈلویا ہے۔ اگر اُسے اس کی بہن نہ ملی تو یہ آدمی معلوم نہیں اور کیسے طریقے سے انتقام لے گا۔“ وہ ہندوؤں کی روایتی بزدلی کے ذریعہ خوفزدہ تھی۔

”یہی ڈر مجھے بھی ہے۔“ میں نے اسے اور زیادہ ڈرانے کے لیے کہا۔ ”میرے اگر میں جلدی پکڑ نہ سکا تو وہ مزدور کوئی اور مار کر سے گا۔ کسی کی بہن کو قید کر لو تو وہ قتل کرنے سے بھی نہیں ملے گا۔ بہتر یہ ہے کہ منشی کی بہن کو آزاد کر دیا جائے۔“

سیٹھانی اور زیادہ ڈر گئی۔ اُس نے کہا۔ ”میرے بچوں پر رحم کریں۔ سیٹھ سے کہیں کہ اگر لڑکی کو اُس نے کہیں چھپا کے رکھا ہوا ہے تو اُسے چھوڑ دے۔ وہ میری نہیں مانتے۔ مجھے ایک شک ہے مگر آپ اُن کے ساتھ بات نہ کرنا ورنہ مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔“

یہ سیدھی سادی عورت تھی اور خوفزدہ بھی تھی۔ میں نے اُس کے خوف میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اُس کے گھر میں نقب بھی لگی تھی۔ جس گھر میں نقب لگے اس گھر والوں کو دیکھیں، وہ خوف سے کسی کئی دن کا پتے رہتے ہیں۔ اس اُکھڑی ہوئی ذہنی حالت میں وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ پولیس انسپکٹر کے ساتھ بات کر رہی ہے۔ دراصل میں نے ہمدردی اور اپنائیت کا مظاہرہ کر کے اس پر اعتماد پیدا کر لیا تھا۔

وہ رد رہتی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔ اُس نے کہا۔ ”مہینے ڈیڑھ سے سیٹھ رات دیر تک باہر رہتا ہے۔ شراب تو پہلے بھی پیتا تھا۔ اب زیادہ پیتا ہے۔ اُس نے میرے ساتھ بے سلوکی بھی شروع کر دی ہے۔ یہ ہمیں سے مجھے شک ہوتا ہے کہ اُس نے لڑکی کو کہیں رکھا ہوا ہے۔ یہ لڑکی کبھی کبھی میرے گھر آیا کرتی تھی۔ خوبصورت لڑکی ہے۔ میرے دل میں طرح طرح کے وہم

میں تھی۔ مجھے ابھی کوئی ایسا ثبوت نہیں ملا تھا کہ یہ لڑکی یعنی مسلمان منشی کی بہن سیٹھ کے قبضے میں ہے، زندہ ہے، ماری گئی ہے۔ کہیں آگے چلا دی گئی ہے۔ میں ایک زبانی شہادت کے تحت اندھیرے میں ہاتھ مار رہا تھا۔

میں نے سیٹھانی کے دل پر قبضہ کرنے کے لیے اُس کی بیٹی کی حمایت میں باتیں شروع کر دیں۔ اُسے کہا کہ یہ منشی بہت بڑا بد معاش تھا۔ اُس نے شریف لڑکی کو درغلا لیا ہے۔ میں اسے پکڑ کر نقب زنی کے ساتھ انگو کی سزا بھی دلاؤں گا۔ مجھے صرف یہ پتہ چل جائے کہ وہ ہے کہاں..... وہ میری باتوں میں پوری طرح جھڑی گئی۔ اندر سے وہ ڈاک کے دو لٹافے لے آئی۔ دونوں پھٹے ہوئے تھے۔ ایک میں سے خط نکال کر پڑھا۔ یہ مسلمان منشی کا خط تھا۔ سیٹھ کے نام لکھا تھا۔ ”میرے بہن کو آزاد کر دو۔ میں تمہاری بیٹی کو چھوڑ دوں گا۔ میری بہن کو میرے گھر پہنچا دو۔ میں صرف چار روز انتظار کر دوں گا۔“ نیچے منشی کا نام لکھا تھا۔ جگہ کا نام نہیں تھا جہاں سے خط پوسٹ کیا گیا تھا۔ میں نے لٹافے پر ڈاک خانے کی مہر دیکھی۔ مہر اگرہ کی تھی۔ دوسرے لٹافے میں سے خط نکال کر پڑھا۔ یہ انہیں پہلے خط کے پانچویں روز ملا تھا۔ یہ بھی منشی کا تھا۔ صرف اتنا لکھا تھا۔ ”سیٹھ ہو شیار ہو جاؤ۔“ اس لٹافے پر بھی اگرہ کی مہر تھی۔ یہ خط لٹافے کے چار روز بعد سیٹھ کے گھر نقب لگی۔

سیٹھانی کو میں نے بتایا کہ دونوں خط اگرہ سے آئے ہیں۔ اُس نے کہا۔ ”اسے (منشی کو) یہ شک ہے کہ اس کی بہن ہمارے پاس ہے۔ میں نے سیٹھ سے کئی بار کہا ہے کہ اگر اس لڑکی کو آپ نے کہیں چھپا رکھا ہے تو اسے آزاد کر دیں اور اپنی بیٹی کو واپس میں مگر وہ کہتے ہیں کہ اس کی بہن کے متعلق انہیں کچھ علم نہیں۔ اس بات پر ہماری لڑائی بھی ہو چکی ہے۔“

”کیا آپ کو شک ہے کہ سیٹھ صاحب نے منشی کی بہن کو کہیں قید کر رکھا ہے؟“ میں

آتے ہیں۔ میری سٹنے والا کوئی نہیں۔ اور وہ خوفزدہ حالت میں یہی رد نے ردتی رہی اور اُس نے مجھے کئی بار کہا کہ میں سیٹھ پر اپلا اثر استعمال کروں اور اُسے یہ پتہ نہ چلنے دوں کہ اُس نے میرے ساتھ یہ باتیں کی ہیں۔

میں نے اسے یقین دلایا کہ میں سیٹھ کو پتہ نہیں چلنے دوں گا۔ اُسے یہ بھی کہا کہ وہ بھی سیٹھ کو نہ بتائے کہ اُس نے میرے ساتھ منشی کی بہن کے متعلق باتیں کی ہیں۔ میں نے کہا: ”میں آپ کے زیورات، آپ کی نقدی اور آپ کی بیٹی واپس لے آؤں گا۔ اگر آپ نے سیٹھ کو یہ باتیں بتادیں جو آپ نے مجھ سے کی ہیں تو سارے معاملہ گڑ بڑ ہو جائے گا“

میرا انتقامی جذبہ

سیٹھانی مطمئن ہو گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس کی ذاتِ باری نے سیٹھانی کی عقل پر جذبات کا پردہ ڈال دیا اور اس کی زبان بے قابو کر دی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بات آئی ہی نہیں کہ اگر مسلمان لڑکی سیٹھ کے جس بیجا میں سے برآمد ہوئی تو میں اسے گرفتار کر لوں گا۔

میں اسے مزید تسلیاں دے کر وہاں سے تھانے میں چلا گیا۔ قاعدے قانون کے مطابق مجھے نقب زنی کی تفتیش کرنی تھی۔ منشی کی بہن کے اغوا یا جس بیجا کی کسی نے رپورٹ درج نہیں کرائی تھی۔ مجھے یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ نقب زنی کا مرکز یہی سیٹھ کا پہلا منشی ہے اور وہ اگرچہ میں ہے۔ اس کی تصویب بھی میرے پاس تھی۔ میرے لیے لازم تھا کہ میں منشی کی گرفتاری کا فوری بندوبست کر تاں کہ میرے ذہن پر منشی کی بہن سوار ہو گئی تھی اور میں صاف

طور پر محسوس کرنے لگا تھا کہ میرے اندر انتقامی جذبہ بیدار ہو گیا ہے۔ لاگتوں میں ہندو لیڈروں نے مجھے دھکی دھکی کرے لگا رکھا تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ اس مسلمان لڑکی کو برآمد کروں گا اور اس ہندو سیٹھ کو رگڑا دوں گا۔ میں اب خدا سے یہی دعا مانگ رہا تھا کہ لڑکی برآمد ہو جائے اور اسی سیٹھ کے قبضے سے برآمد ہو۔ مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ وہ اسی کے قبضے میں ہوگی۔ محض شک تھا۔ سیٹھانی نے میرے شک کو ذرا مضبوط کر دیا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ سراسر غرضانی کا لبا سفر اختیار کروں یا چاہا بازی سے کام لوں۔

میں نے ایک چال سوچ لی تھی۔ تھانے میں بیٹھ کر اس پر غور کیا اور اللہ توکل اسی پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سیٹھ میرے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ میں نے اسے بلایا۔ وہ غصتے کے عالم میں میرے سامنے آیا۔ اُس نے میرے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا ”انیکٹر صاحب! آپ نے اچھی حرکت نہیں کی“ میں نے اُسے کوئی جواب دینے کی بجائے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور اسے فروٹ اور مین کی بوتلیں لانے کو بھیج دیا۔

”سیٹھ صاحب! میں نے کہا۔“ سچو کچھ ہوا اس کا مجھے بہت افسوس ہے اس سے زیادہ افسوس مجھے اس بات پر ہے کہ آپ جیسے پڑھے لکھے اور صاحبِ حیثیت انسان نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں معمولی سا پولیس انیکٹر ہوں۔ میری ڈیوٹی ایسی ہے کہ شریف لوگوں سے مجھے بعض اوقات غیر شریفانہ سوال پوچھنے پڑتے ہیں۔ یہ میری نوکری اور میری روزی کا معاملہ ہے۔ مجھ سے تو آپ کا منشی اچھا ہے جو شام تک اپنا کام ختم کر کے رات آرام سے سو جاتا ہے۔ میں تو رات سو بھی نہیں سکتا۔ آپ اپنے کس پر غور کریں۔ یہ میرا فرض ہے کہ آپ کی حناال کی کمائی کے زیورات، نقدی اور کپڑے غائب ہو گئے ہیں، آپ کو ایک ایک بلی واپس دلاؤں۔ پھر مجھے شک ہوتا ہے کہ آپ کی جوان بیٹی بھی لاپتہ ہے لیکن آپ بڑائی

کردوں گا۔ ایس پی آپ کو غائبانہ طور پر جانتا ہے۔ اس نے آپ کا نام لے کر کہا تھا کہ یہ سیٹھ سیاسی لیڈر ہے۔ اُسے آئندہ تمہارے نہ بلانا۔ جب ضرورت پڑے، خود اس کے پاس جاؤ اور اس کے ساتھ احترام سے بات کرو۔ حکومت برطانیہ کسی سیاسی لیڈر کو ناراض نہیں کرنا چاہتی“

یقین کریں کہ ہندو سیٹھ میں غبار سے کی طرح ہوا بھجھتی۔ اتنا ہوشیار اور چالاک آدمی اپنی جھوٹی تعریف سن کر اٹوٹا کھٹا بن گیا۔ میں نے کہا۔ ”آپ کے سامنے میری کیا حیثیت ہے۔ ایس پی مجھے سختی سے کہ گیا ہے کہ صرف نقب زنی کی تفتیش کرو۔ کسی لڑکی کے چکر میں نہ پڑو۔۔۔۔۔ سیٹھ صاحب! آپ میرے ساتھ تعاون کریں اور نقب زنی کی تفتیش میں میرا ساتھ دیں۔ میں اب کسی لڑکی کا ذکر تک نہیں کروں گا“

میں اب اس کوشش میں تھا کہ وہ سورج غروب ہونے تک میرے پاس بیٹھا رہے۔ سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ فریٹ اور بوتلیں لگتی تھیں۔ میں اسے دوست بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس کے ذہن سے منشی کی بہن کا بوجھ اتر گیا۔ میں نے عجز و انکساری سے اُسے آسمان پر چڑھا دیا۔

سورج غروب ہو گیا۔ وہ میرا ایسا گردیدہ ہو چکا تھا کہ اٹھتا ہی نہیں تھا۔ میں اندھیرے کا ہی انتظار کر رہا تھا کیونکہ مجھے اس کا تعاقب کرنا تھا۔ مجھے اپنے تجربے کی بنا پر یقین تھا کہ اگر اُس نے منشی کی بہن کو کہیں چھپا کے رکھا ہوا ہے تو وہاں ضرور جائے گا۔ اُس کی بیوی نے میرے شکوک کی تائید کر دی تھی۔

آخر وہ اٹھا اور بڑے پیار سے ہاتھ ملا کر بولا۔ ”بڑا ناٹا۔ میں رشوت پیش نہیں کر رہا۔ آپ میرے بھائی ہیں۔ اگر آپ کو کسی قسم کی کوئی ضرورت ہو، جتنی رقم

کے ڈر سے چھپاتے ہیں۔ میں اسے بھی فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی عزت درپردہ واپس لائوں۔ حالانکہ آپ چھپا رہے ہیں لیکن میں آپ کی عزت کو اپنی عزت اور آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھتا ہوں“

”لیکن آپ نے مجھ پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ میں نے منشی کی بہن کو اغوا کر لیا ہے۔“ سیٹھ نے ایسے پلچے میں کہا جس میں رعب کی بجائے دوستی کا رنگ تھا۔

”جی ہاں“ میں نے کہا۔ ”آپ نے کانگریس کی پوری درکنگ کمیٹی کے ساتھ مجھ پر ملبار کر دی اور مجھ پر فرقد پستی اور ظالم مٹول کا الزام عائد کیا۔ پھر کشر اور گورنر کی دھکی دی۔ آپ نے مجھ پر جھوٹے الزام عائد کیے۔ میں نے آپ پر جھوٹا الزام عائد کر کے جو ابی کر لیا اور ایس پی کو بلا کر اپنے تحفظ کا بندوبست کیا۔ میں آپ پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ آپ کشر تک پہنچنے کچھ وقت لگائیں گے لیکن میں یہیں بیٹھے بیٹھے انگریز ایس پی کو یہاں بلا سکتا ہوں۔۔۔۔۔ تو سیٹھ صاحب! میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔ جو ہوا سو ہو گیا۔ اگر آپ اپنی بیٹی کے متعلق مجھے کچھ نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتائیں۔ میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں“

”اور آپ نے ایس پی کے سامنے یہ الزام عائد کیا ہے کہ میں نے منشی کی بہن کو اغوا کر لیا ہے؟“ اس نے کہا۔ ”اس کا کیا بننے کا ہے آپ نے یہاں تک کہ دیا تھا کہ پہلے واروعد نے میرے خلاف کیس رجسٹر نہیں کیا تھا“

”ایس پی نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں نے کہا۔“ اُس نے آپ کو تو ڈانٹ دیا تھا لیکن بعد میں اُس نے جو میری بے عزتی کی وہ میں ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اُس نے مجھے کہا کہ اس مقالے میں رہنا چاہتے ہو تو تیز سے رہو ورنہ لائن حاضر کر کے تمہاری ساری سردیں تباہ

میری یہ سیکم ایک مجرا تھا۔ خدا نے طبیعت ایسی ڈھیٹ بنائی ہے کہ میں یہ جو اکیلے سے ٹل نہ سکا۔ اس کے نتائج میرے خلاف بھی جاسکتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ میں منشی کی بہن کو سیٹھ کی قید سے برآمد کر لوں تو لڑکی کہہ دے کہ میں اپنی مرضی سے یہاں آئی ہوں اور سیٹھ نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ مگر میری جو ایک فالٹو جس سے وہ تباہی تھی کہ لڑکی مظلوم ہے اور اس پر زیادتی ہو رہی ہے اور یہ سیٹھ اپنی بیٹی کا انتقام اس لڑکی سے لے رہا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا کیا میں پاگل ہو گیا ہوں؟ میرا دماغ چل تو نہیں گیا، جو کچھ بھی تھا، میں ایک خطرہ مول لینے کے لیے پوری طرح تیار ہو کر تھانے سے نکلا۔

سیٹھ کے تعاقب میں دوکانٹیل سادہ کپڑوں میں چلے گئے تھے۔ دونوں کو آپس میں اتنا فاصلہ رکھنا تھا کہ ایک دوسرے کا اشارہ دیکھ سکیں۔ مجھے اپنی پارٹی اس طرح بکھر کر دکھنی تھی کہ پچھلے کانٹیل کا اشارہ دیکھ یا سن سکیں۔ ہمیں اکٹھے نہیں چلنا تھا۔ میں اپنی پارٹی سے ذرا آگے نکل گیا۔ مجھے یہ سہولت حاصل تھی کہ میں اس شہر میں نیا تھا اس لیے شہر کے لوگ مجھے پہچانتے نہیں تھے۔ رات کا اندھیرا بہت فائدہ دے رہا تھا۔ آگے والے دوکانٹیلوں میں سے پچھلے نے مجھے ایک جگہ ہاتھ سے اشارہ کیا تو میں سمجھ گیا کہ سیٹھ اپنے گھر نہیں جا رہا۔ سیٹھ کہیں بہت آگے تھا۔ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس اشارے کی طرح مجھے آگے سے اشارے ملتے رہے اور میں اپنی پارٹی کو اشارے دیتا لگیوں کے موڑ مڑا گیا۔ آگے کھیت اور میدان آگے۔ معمولی سی قسم کے کچھ مکان تھے جو ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ یہ شہر کا معنائاتی علاقہ تھا۔

مجھے دکنے کا اشارہ ملا۔ پھر پچھلا کانٹیل میرے پاس آ گیا اور اس نے مجھے بتایا کہ

چاہیے، مجھے بجائی سمجھ کر بتادینا۔ میں کل کچھ رقم پیش کروں گا؟ ہنس کر کہنے لگا۔ "ہمیں ایلٹے رہنا ہے۔"

"آپ کو اپنی ضرورت نہیں بتاؤں گا تو اور کسے بتاؤں گا۔" میں نے ہندوؤں کی طرح ہاتھ جوڑ کر کہا: "اگر آپ کو میری ضرورت پڑے تو اپنے نوکر کو بھیج دیجئے گا۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

جہاں لڑکی قید تھی

اور وہ چلا گیا۔ میں نے فوراً اپنے مخصوص کانٹیل بلائے، انہیں دردی اتار کر سائے کپڑے پہنے کو کہا۔ پھر انہیں ہدایت دی کہ سیٹھ کا تعاقب کریں۔ اگر یہ اپنے گھر چلا جائے تو اور دھڑکتے رہیں۔ خواہ ساری رات گزر جائے۔ اس پر نظر رکھیں اور صبح رپورٹ لیا پھر میں نے انہیں کچھ خفیہ ہدایات دے کر روانہ کر دیا۔ ایک اشارہ بھی مقرر کر دیا۔ میں نے چھکانٹیل سادے کپڑوں میں تیار کر لیے۔ سب سے کہا کہ قبضوں کے نیچے کر کے گرد ایک ایک ہتھکڑی بیچ زنجیر باندھ لیں لیکن ان کی جھینکار نہ ہو۔ اگر ضرورت پڑے تو ہتھکڑیوں کو ہبی ہتھکار کے طور پر استعمال کریں۔ میں نے بھی سادے کپڑے پہنے اور ریو اور پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ اٹے۔ ایس۔ آئی کو تھانے میں چھوڑ دیا۔ وہ ہا تھا۔ میری سیکم سے آگاہ تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ میرے جانے کے بعد کسی ہندو کو بندر لیا گیا اطلاع دے دے گا۔ میں نے ایک مسلمان کانٹیل کو آگ لے جا کر کہا کہ وہ اے۔ ایس۔ آئی پر نظر رکھے۔ میں اپنی پارٹی لے کر روانہ ہو گیا۔

ہے۔ اس پر خاموشی طاری ہوگئی۔ ہم دو مہی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے بڑی ہی بلند آواز سے کہا: ”مجھے کیوں پریشان کرنے ہو؟ جاؤ۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔ یہ یقیناً“ مکان کے اندر والوں کو خبردار کرنے کے لیے چلا یا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر پوری طاقت سے گھونسا مارا۔ وہ پچھلے کوگرا۔ میں نے اپنی پارٹی کو اشارہ دے دیا اور ٹارچ کی روشنی ادھر کو کی جی بھر اس نے چابی پھینکی تھی۔ مجھے چابی نظر آئی۔

ہیڈ کانسٹیبل نے اس آدمی کو پکڑ لیا۔ میں چابی اٹھا کر مکان کی طرف دوڑا۔ مکان کی پچھلی طرف دو کانسٹیبل موجود تھے۔ میں نے تالا کھولا اور دروازے کو دھکیں کر بہت تیزی سے اندر چلا گیا۔ کانسٹیبل بھی میرے پیچھے آئے۔ یہ تنگ سامحن تھا۔ دائیں طرف ایک کمرے کا دروازہ درسا کھلا۔ اندر لائٹن کی روشنی تھی۔ دروازہ لیک ایک بند ہوا۔ پیشتر اس کے اندر سے چٹخنی چڑھا دی جاتی، میں نے دوڑ کر کواڑوں کو دھکا دیا۔ میرے کانسٹیبل بھی ہوشیار تھے۔ وہ میرے ساتھ ہی دروازے میں گود کر داخل ہوئے۔

میں نے ریوالور نکال لیا اور کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ پتنگ پر ایک جوان لڑکی لیٹ ہوئی تھی جس کے جسم پر صرف قمیض تھی۔ کمرے میں شراب کی بوتلی۔ تپانی پر شراب کی بوتل اور تین گلاس رکھے تھے اور پیٹیٹوں میں روٹ گوسٹ تھا۔ ایک آدمی دوسرے پتنگ کے نیچے گھس رہا تھا۔ میرے ایک کانسٹیبل نے اُسے پیچھے سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ یہ سیٹھ نہیں تھا۔ لباس سے اُسی کی سطح کا امیر کبیر آدمی لگتا تھا۔

لڑکی اٹھ کر سیٹھ گئی۔ وہ واقعی خوبصورت لڑکی تھی۔ میں نے اُس سے نام پوچھا۔ اس نے نام بتایا تو پتہ چلا کہ یہ منشی کی بہن ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل اس مکان کے پہرہ دار کو اندر لے آیا جو ہمیں باہر لے گیا تھا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا: ”وہ سیٹھ کہاں ہے؟“

سیٹھ ایک مکان کے اندر چلا گیا ہے۔ میں نے مکان کو گھیرے میں لے لیا پھر میں دروازے کی طرف گیا۔ یہ چھوٹا سا مکان تھا جو بمشکل چارمرے کا تھا۔ یہاں سیٹھ کا کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے کسی کو بھی میں جانا چاہیے تھا۔ اتنے غریبانہ مکان میں اس کا کیا کام؟... ایک آدمی اندر سے نکلا اور اس نے باہر کی زنجیر جوٹھا کر تالا لگا دیا۔ اندھیرے میں مجھے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ دروازے کے قریب ٹپٹنے لگا۔

میں اس کی طرف چلا تو اس نے پوچھا: ”کون ہے بھائی؟“

میں اس کے قریب چلا گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا: ”بھائی صاحب پولیس چوکی کو کونسا راستہ جاتا ہے؟“ میں اسے ذرا آگے لے گیا۔ ادھر سے میرا ہیڈ کانسٹیبل آ گیا۔ ٹارچ اس کے ہاتھ میں تھی میں نے اس سے ٹارچ لے لی۔ یہ آدمی مجھے راستہ بتانے لگا تو میں نے ٹارچ کی روشنی اس کے منہ پر ڈالی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے ہنس کر کہا: ”بلک صاحب! یہ تو ہمارا پرانا دوست ہے۔“

یہ آدمی شہر کے اُن بدعاشوں میں سے تھا جنہیں میں نے تھانے میں بلایا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: ”اس مکان میں کیا ہے؟ یہ تو ہمارا مکان ہے؟ تالا لگا کر کہاں جا رہے ہو؟“ ایک ہی بار اتنے سارے سوالوں سے وہ گھبرا گیا۔ اُس نے ہلکا کر کچھ کہنے کی کوشش کی تو میں نے پوچھا: ”سیٹھ اندر کیا کر رہا ہے؟“ میں نے ٹارچ بجھا دی۔

میں نے اندھیرے میں دیکھ لیا کہ اُس نے ہاتھ پیچھے کو ہلایا اور ذرا پرے مجھے کچھ گرنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ وہ مجھے اناٹھی جھٹاتا تھا۔ میں نے ٹارچ جملے بغیر ادر دیکھے بغیر اُسے کہا: ”چابی اٹھا لاؤ۔“

میں سجد گیا تھا کہ اس نے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چابی پھینک دی

رٹکی نے اشارے سے بتایا۔ اُس پلنگ کے نیچے ہے۔ میں نے فرما جان لیا کہ رٹکی نے شراب پی رکھی ہے یا اُسے پلانی گئی ہے۔

دوکانیٹیوں نے پلنگ کے نیچے سے سیٹھ کو نکال لیا۔ اُس نے بھی صرف قیض پہن رکھی تھی۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ پلنگ پر اُس کی پتلون پڑی تھی۔ اُس نے پتلون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر پرے کر دیا۔ دونوں سیٹھ کانپ رہے تھے۔

میں نے ان دونوں ہندوؤں کو اور ان کے پہرہ دار کو ہتھکڑیاں لگائیں۔ ایک کانٹیل کو تھانے بھیج کر اسے۔ ایس۔ آئی کو بلایا اور رٹکی اور سیٹھ کے ڈاکٹری معائنے کا انتظام کیا۔

میں اس انتظام کی تفصیلات نہیں سناؤں گا کیونکہ یہ کہانی ہماری پچھانی بھی پڑھیں گی۔ آخری رپورٹ تو صنایع بیڈ کو آرٹھر سے لینی تھی۔ یہ رپورٹ حاصل کرنے کے لیے جو فروری اور ابتدائی

کارروائی ہوتی ہے، وہ میں نے رٹکی اور سیٹھ کو سول سرجن کے پاس اسی وقت لے جا کر کر دالی۔

میں نے رات کی گاڑی سے اس کارروائی اور خاص چیز کو ٹیسٹ کے لیے بھیج دیا۔ اس مکان کو میں نے سزمہ کر دیا تھا اور دوکانیٹیوں کی وہاں ڈیوٹی لگادی تھی۔ دونوں سیٹھوں

اور ان کے پہرہ دار کو میں نے حوالات میں بند کر دیا۔ پہرہ دار کو میں نے حوالات کے دفتر سے کمرے میں بند کیا تھا۔ جو عورتوں کی حوالات تھی۔ اس وقت خالی تھی۔ اسے الگ کرنے سے

میرا مقصد یہ تھا کہ اُسے میں سُلطانی گواہ بنانا چاہتا تھا۔ اب حوالات میں صورت حال یہ تھی کہ وہاں پہلے سے ایک ملازم بند تھا جس کے کندھے پر زخم تھا۔ وہ نسبتاً زنی کا ملازم تھا اور جس

کے گھر اس نے لقب لگائی تھی وہ بھی اسی حوالات میں بند تھا۔

ساتھ جا کھڑا ہوا۔ وہ سناخوں کے اندر تھا۔ اُس نے میرے ایمان کی بولی دی۔ دس ہزار روپیہ۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ میں اس کیس کو گول کر دوں اور انہیں چھوڑ دوں۔ دوسرے سیٹھ نے کہا۔ دس ہزار میں بھی دُف کا۔ میں نے ٹالنے کی کوشش کی تو بولی چڑھنے لگی۔

بارہ ہزار..... پندرہ ہزار..... بیس..... پچیس ہزار..... میں نے آخر سیٹھ سے کہا۔ ”آپ نے شام کو یہاں سے رخصت ہوتے وقت کہا تھا کہ کسی بھی قسم کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا۔ سیٹھ صاحب! مجھے ایک ضرورت پیش آگئی ہے یہ پوری کر دیں۔“

”ہاں۔ ہاں۔ اس نے کہا۔“ بتائیے ابھی پوری کر دوں گا۔“

”مجھے آپ کے اقبالی بیان کی ضرورت ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ بہت جھنجھلا یا۔ پھر وہ دھمکیوں پر اتر آیا۔ میں وہاں سے خاموشی سے ہٹ آیا اور دفتر میں بیٹھ کر اس صورتِ حال پر غور کرنے لگا جو میں نے پیدا کر لی تھی۔ میرے ہندو لے۔

ایس۔ آئی نے مجھے ڈرایا تو نہیں، اتنا ضرور کہا۔ ”کسی رپورٹ کے بغیر آپ نے خواہ مخواہ نئی مصیبت مول لے لی ہے۔ یہ لوگ اتر در سوخ والے ہیں۔ کل ضمانت پر رہا ہو جائیں گے اور ہمیں پریشان کریں گے۔“

میں نے اس کی بات سن لی اور اپنے آپ سے کہا کہ اللہ مالک ہے۔ ایک مسلمان رٹکی کو کافروں کی ایسی ذیل قید سے رہائی دلائی ہے۔ خدا میری ضرور مدد کرے گا۔ رٹکی

تھانے میں تھی۔ میں اس ڈر سے اسے اپنے کارٹھ میں نہیں لے جانا چاہتا تھا کہ میرے مشافق کے ہندو افراد کوئی اور فتنہ کھڑا کر دیں گے۔ میں نے رٹکی کو دفتر میں جٹھا کر پوچھا کہ وہ اس کی قید میں کس طرح پہنچی ہے۔ وہ بہت روئی۔ اُسے زبردستی شراب پلانی گئی تھی

مجسٹریٹ نے کہا: ”آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ اتنے معزز آدمیوں کو ایسے کیس میں ٹوٹ کر مارا اچھا نہیں لگتا۔“

”اگر آپ لڑکی کو بدچلن اور اس کے ساتھ بدکاری کرنے والوں کو معزز سمجھتے ہیں تو آپ جو چاہیں لکھیں۔ میں نے اسے کہا یہ لڑکی آپ کے قبضے میں ہے۔ صرف یہ پیش نظر رکھیں کہ عدالت میں میرے بیان بھی ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھیں کہ اس لڑکی کے ساتھ نقب زنی کی ایک واردات، منسک چے اور یہ بھی نوٹ کر لیں کہ پہلے تھا نیندا رنہ اس لڑکی کی نگہبانی کی رپورٹ رجسٹر نہیں کی تھی۔ ایس پی صاحب کے حکم سے اسے معطلی کر دیا گیا ہے اور انکو امری کا حکم مل چکا ہے۔ لڑکی اس انکو امری میں بھی پیش ہوگی۔ آپ کی اپنی مرضی ہے۔ جو چاہیں لکھیں۔ بیان آپ کے پاس رہیں گے جنہیں آپ نفاذ میں مرنہ مہر کر لیں گے۔ میں آپ کو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ یہ ایک خطرناک کیس ہے۔ میں تو اس میں گڑبڑ کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس لڑکی کا بھائی نقب زنی میں مطلوب ہے اور اس سپیڈ کی لڑکی اس آدمی کے پاس ہے۔“

مجسٹریٹ کچھ گھبرا یا۔ سر ہلا کر زیر لب بولا: ”یہ کوئی گورکھ دھندا معلوم ہوتا ہے؟“

”جی ہاں“ میں نے آہ بھر کر کہا: ”میں نے تو ابھی پوری طرح چارج بھی نہیں لیا تھا کہ یہ گورکھ دھندا میرے گلے میں آپڑا اور ایس پی صاحب آدھکے درنہ میں کوئی چمکڑ چلا لیتا۔“

میں نے اس ہندو مجسٹریٹ کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ پھر بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ ان ہندو سپیڈوں کو بچانے کے لیے کوئی گڑبڑ ضرور کرے گا۔ بیان لینے اور لکھنے میں سارے تین گھنٹے لگے۔ مجسٹریٹ نے لڑکی کے دستخط لاکے بیان ایک نفاذ میں

اور شراب اسے ہر رات پلائی جاتی تھی۔ اس کا بیان سن کر میں نے اسے دو تین باتیں بتائیں اور اسے یہ کہہ کر تسلی دی کہ میں مسلمان ہوں اور وہ مجھ پر بھروسہ رکھے۔ قانون کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ پورے کیے بغیر کوئی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ میں اس کا بیان قلم بند نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ عدالت میں ان کی اہمیت ہی کوئی نہیں ہوتی بلکہ اٹلٹنک کیا جاتا ہے۔ شک یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کو پولیس نے اپنی حراست میں رکھ کر اپنی مرضی سے بیان لکھ لیا ہے۔

میں نے لڑکی کو ساتھ لیا۔ اسے۔ ایس۔ آئی کو بھی ساتھ لیا اور اسے کہا کہ مجھے مجسٹریٹ کے گھر لے چلے۔ اس کے گھر گئے تو رات کے باہر بچنے والے تھے۔ اسے بگایا۔ ایس کی ذمیت بتائی اور درخواست کی کہ لڑکی کے بیانات قلم بند کر کے سر مہر کر لیے جائیں اور قانون کے مطابق لڑکی کو کسی معزز شہری کی تحویل میں دیا جائے۔ مجسٹریٹ ہندو تھا۔ وہ لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ ہم برآمدے میں بیٹھے رہے۔ دس منٹ بعد مجسٹریٹ ہمارے پاس آیا اور ہمارے قریب بیٹھ کر بولا: ”لڑکی بالکل معمولی حیثیت اور مشکوک چال چلن کی ہے۔ آپ شہر کے بہت بڑے دو آدمیوں کے خلاف بیان دوا رہے ہیں۔ آپ یہ تھتھہ میں پرتیم نہیں کر سکتے، وہ ہندو چوری کر رہا تھا۔“

”میں اس تھتھہ کو ہاتھ میں ہی نہیں لینا چاہتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ آج ایس پی صاحب بہادر اچانک تھانے میں آگئے اور انہوں نے ذاتی طور پر حکم دیا ہے کہ لڑکی برآمدگی جائے اور ملزمانوں کو ان کی حیثیت کا لحاظ کیے بغیر گرفتار کر کے رپورٹ آہیں بھیجی جائے۔“

”اگر آپ مشورہ دیں تو میں لڑکی کے بیان میں تھوڑی سی گڑبڑ کر دیتا ہوں۔“

سیٹھ کے گھر گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ سیٹھ کی بیٹی اُس کی ہم عمر ہے اور اس کی سہیلی ہے۔ تقریباً ڈیڑھ مہینہ گزرا۔ سیٹھ کے گھر کا نوکر اس لڑکی کے گھر آیا اور کہا کہ لڑکی کا بھائی اُسے سیٹھ کے گھر بلا رہا ہے۔ لڑکی نے بڑھو اڑھا، گھر کو تالا لگایا اور نوکر کے ساتھ چلی گئی۔ سیٹھ کے گھر کو ایک راستہ شہر کے اندر سے جاتا تھا اور دوسرا راستہ شہر سے باہر جاتا تھا۔ لڑکی کو نوکر شہر کے باہر کی طرف سے لے گیا۔ اس نوکر کو لڑکی بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔ کوئی اجنبیت نہیں تھی۔ بے فکر ہو کر اس کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔

راتے میں نوکر نے لڑکی سے کہا۔ ”مجھے ایک کام یاد آ گیا ہے۔ اس مکان میں میرا ایک اُستادہ دار رہتا ہے۔ اسے ایک پیغام دے آؤں۔“ یہ وہی الگ تھلک مکان تھا جہاں سے میں نے لڑکی کو برآمد کیا تھا۔ لڑکی رگ گئی اور کہا کہ جاؤ پیغام دے آؤ۔ نوکر نے اُسے کہا۔ ”تم یہاں اکیلی کھڑی اچھی نہیں لگتی۔ میرے ساتھ ہی آ جاؤ۔“ لڑکی اس کے ساتھ چلی گئی۔ اس مکان کے دروازے پر پہنچ کر نوکر نے لڑکی سے کہا۔ ”تم بھی اندر آ جاؤ۔ اندر سب عورتیں ہیں۔“ لڑکی اندر چلی گئی۔

نوکر نے دروازہ اندر سے بند کر دیا کرے سے دو آدمی نکلے۔ انہوں نے لڑکی کو دبوچ کر اٹھالیا۔ ایک نے اس کے منہ پر پانچہ لگا دیا۔ لڑکی پردہ نشین اور شریف تھی۔ بہوش ہو گئی۔ اس کے بعد اُسے کچھ یاد نہیں کہ وہ دن اور رات میں کتنی کتنی بار بے ہوش ہوئی۔ ہر شام کے بعد یہ ہندو سیٹھ جس کے گھر نقب لگی تھی اس کے پاس آ جاتا۔ اُسے فروٹ وغیرہ کھلایا جاتا۔ نہایت اچھا کھانا دیا جاتا۔ اُسے زبردستی شراب پلائی جاتی اور اسے خراب کیا جاتا۔ دن بھر وہ قید رہتی۔ دو مرتبہ اُس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن دو پہرے دار موجود رہتے تھے۔ انہوں نے دونوں مرتبہ اُسے پکڑ لیا۔

بند کیے اور ہمارے سامنے لاکھ سے لاکھ سزائیں لکھ کر کے اپنی صندوقچی میں رکھ لیا۔ مجسٹریٹ کے لیے ہوتے بیانات پولیس کو نہیں دکھائے جاتے۔ مقدمے کے دوران مجسٹریٹ لفاغ عدالت کے حوالے کرتا ہے۔ اب لڑکی کو کسی کی تحویل میں دینا تھا۔ میں تو کسی کو جانتا نہیں تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے ایک مسلمان کا نام بتایا۔ اُسے اسی وقت بلا لیا گیا۔ یہ شہر کا ایک معزز مسلمان تھا۔ مطلوبہ کاغذی کارروائی کر کے لڑکی اُس کے حوالے کر دی گئی اور اسے بتایا گیا کہ عدالت کی طلبی پر وہ لڑکی کو عدالت میں پیش کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔

لڑکی پر کیا گزری

لڑکی اس کے ساتھ جانے سے ڈر رہی تھی۔ بار بار کہتی تھی کہ مجھے اپنے بھائی کے پاس جانے دو۔ میرے بھائی کو بلا دو۔ اسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا بھائی یہاں نہیں ہے اور اس کا گھر پولیس نے سزائیں لکھا ہے۔ باہر جا کر میں نے اُسے تسلی دلا سہ دیا اور بتایا کہ وہ یوں سمجھے کہ اپنے ماں باپ کے گھر جا رہی ہے۔ وہ بے چاری اس قدر خوفزدہ تھی کہ بات کم کرتی اور روتی زیادہ تھی۔ اس کی جسمانی حالت تو بہت ہی بُری تھی۔ میں نے اس معزز مسلمان کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ لڑکی پر کیا گزری ہے۔ اُسے میں نے یہ بھی بتا دیا کہ یہ ہندو مسلم تصادم ہے۔ مسلمان جابلے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

لڑکی نے مجھے جو بیان دیا تعداد مختصر آؤں ہے کہ اس کا بھائی ہندو سیٹھ کا منشی ہے اور اُس کے گھر آتا جاتا ہے۔ اُسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا بھائی اس شہر میں نہیں ہے۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ وہ سیٹھ کے کام سے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ یہ لڑکی کئی بار

میں اور گول مول الفاظ میں کہیں جس سے لڑکی کو یہ شک ہوگا، اسے قتل کر دیا جائے گا یا کسی اور کے حوالے کر دیا جائیگا۔ اٹھنے اُس کی سُن لی اور مجھے اس کی نجات کا سبب بنایا۔ اس نے بتایا کہ میں جب اُس کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ سمجھی کہ میں وہ آدمی ہوں جس کے حوالے اسے سیٹھ کرے گا۔ مگر سیٹھ نے باہر کا دروازہ کھلتے ہی کمرے کا دروازہ ذرا سا کھولا اور دروازہ بند کر کے پتنگ کے نیچے چلا گیا۔

لڑکی کی بزدستان سُن کر میری جو جذباتی حالت ہوئی تھی، وہ پائلن پرن کی کیفیت تھی۔ مٹھانیداری میرے سامنے آجاتی تھی ورنہ میں ایسا بھڑکا کہ دل میں آئی کہ ان دونوں سیٹھوں کو جنہیں میں نے حالات میں بند کر دیا تھا، اپنے ہاتھوں اس طرح قتل کروں کہ کئی دن تڑپتے رہیں اور تڑپ تڑپ کر مریں۔ لڑکی روتی تھی اور بار بار اپنے بھائی کا نام لیتی تھی۔ مجھے اس کے بھائی پر غصہ آ رہا تھا جس کی عشق بازی نے اس کی معصوم بہن کو جنہیں پھینک دیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے گناہوں کی سزا بھگت رہی تھی۔ میں نے طے کر لیا کہ نقب زنی کا کس پوچٹ ہو جائے، میری نوکری چلی جائے، میں ان دونوں کافروں کو جیل بھجوا کر دمر کروں گا۔

دوسرے دن ان دونوں کا ادران کے پہرہ دار کا ریمانڈ لینا تھا۔ میں نے اسے ایس۔ آئی سے کہا کہ تینوں کو مجھڑٹ کے پاس سات روز کے ریمانڈ کے لیے لے جاؤ۔ اس نے پوچھا ”سیٹھوں کو ہتھکڑیاں تو نہیں لگیں گی؟“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا ”وہ اخلاقی جرم کے ملزم ہیں۔ ہتھکڑیاں لگیں گی۔“

”سوچ لیں ملک صاحب! اس نے کہا۔ یہ معمولی آدمی نہیں ہیں۔“

میں نے زور دے کر کہا۔ ”انہیں ہتھکڑیاں لگیں گی مہن بھائی۔ انہیں ہتھکڑیاں

لڑکی نے بتایا کہ پہلے پانچ چھ دن سیٹھ اُسے کہتا رہا کہ ہندو ہو جاؤ اور میں تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔ وہ نہ مانی۔ اس کا کرنے سے بغیر شادی کے ہیوی بنائے رکھا۔ لڑکی نے اس کے پاؤں پکڑے، زور دے کر فریادیں کیں کہ میرے بھائی نے تمہاری بہت خدمت کی ہے۔ اسی کی خاطر مجھے چھوڑ دو۔ ایک بار سیٹھ نے اُسے کہا۔ ”تمہارے بھائی نے میری جو خدمت کی ہے، میں تمہیں اسی کا صلہ دے رہا ہوں۔“ لڑکی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ سیٹھ کی بیٹی اُس کے بھائی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ چند دنوں بعد سیٹھ نے اُسے کہا کہ ہندو مذہب اختیار کر لو، میں تمہیں ایک بڑے خوبصورت ہندو جوان سے بیاہ دوں گا۔ لڑکی نہ مانی۔ پھر سیٹھ نے ہر شام اپنے ایک دوست کو وہاں بلو کرنا شروع کر دیا۔

لڑکی نے مجھے اپنی بیٹا سنا تے ہوئے کہا۔ ”شروع میں وہ مجھے زور سے شراب پلاتے تھے۔ میں نے جب ربابی کی امیدیں توڑ دیں تو میں نے شام کو خود ہی شراب پینی شروع کر دی۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ میں اپنے آپ کو بھول جاتی تھی اور یہ احساس پیدا ہو جاتا تھا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے یہی بہتر ہے۔“

اُس نے خود کشی کے طریقے بھی سوچے اور اُس نے سیٹھ کو قتل کرنے کے طریقے بھی سوچے مگر اسے کوئی ذریعہ نظر نہ آیا۔ کیونکہ وہ شریف اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اُس نے بتایا کہ اس شام جس شام میں نے سیٹھ کو اس کے ایک دوست کے ساتھ مو تعہ پر پکڑا، سیٹھ کا دوست سیٹھ سے پہلے وہاں پہنچ گیا تھا۔ سیٹھ دیر بعد آیا اور اپنے دوست سے کہا۔ ”آج جو عیش کرنی ہے کرو۔ کل چھٹی۔“

دوست نے یعنی دوسرے سیٹھ نے اس سے پوچھا کہ چھٹی کیوں؟ اس نے جواب دیا ”گڑ بڑ ہو گئی ہے۔“ اس کے بعد انہوں نے آپس میں جو باتیں کیں وہ اشاروں اشاروں

یہ تو انتقام کا غصہ تھا۔ میں نے اس پر قابو پا کر حقائق پر غور کیا تو محسوس کیا کہ میں نے خطرہ مول لیا ہے۔ وہ خطرہ تین گھنٹے بعد تھانے کے دروازے پر آگیا۔ اس سے ایک گھنٹہ پیشتر سیٹھ واپس آچکے تھے۔ اے۔ ایس۔ آئی نے بتایا کہ راستے میں تماشا میوں کا ہجوم ہو گیا اور یہ جلوس کچہری تک ساتھ گیا۔ ریما نڈلے نے کھلے تو ہجوم دگنا ہو گیا تھا۔ لطیفہ یہ ہوا کہ دونوں سیٹھوں کا نام لے لے کر لوگوں نے زندہ باد اور انگریزی راج مردہ باد کے نعرے لگائے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ان دونوں کو انگریزی حکومت نے سیاسی لیڈری کے جرم میں گرفتار کیا ہے۔ ہندوؤں کا باپو مہاتما گاندھی گرفتاری اور جیل کا شدید انشیدانی تھا اس لیے ہندو اُسے ہیرو سمجھتے تھے۔ ان سیٹھوں کو بھی انہوں نے ہیرو بنا دیا۔

تصویر نے مدد کی

وہ حالات میں آئے تو ان کے رنگ زرد ہو چکے تھے اور ان پر خاموشی طاری تھی۔ ایک گھنٹہ بعد ہندوؤں کا ایک جلوس جس کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہی ہو گی تھانے کے سامنے آکر "سلام مردہ باد" کے نعرے لگانے لگا اور ہمارے لیڈروں کو رہا کر دو" کے بھی نعرے لگے۔ "جے ہند" کے بھی نعرے لگے۔ میں پچھلک کی طرف گیا تو اُدھر سے چار پانچ لیڈر آگے آئے۔ یہ صورتِ حال بگڑ سکتی تھی لیکن میں نے ہوش ٹھکانے رکھے۔ لیڈروں نے آگے آکر میرے ساتھ توہین آمیز باتیں کیں۔ مجھے مشتعل کرنے کی کوشش کی تاکہ میں تشدد کر دوں لیکن مجھے اپنے آپ پر قابو تھا۔ ان میں وہ لیڈر بھی تھے جو سیٹھ کے ساتھ میرے پاس پہلے بھی آچکے تھے۔ میں انہیں اپنے دفتر میں لے گیا اور انہیں پوری تفصیل

لگا کر لے جاؤ۔"

دونوں سیٹھوں نے ہتھکڑیاں نہ لگانے کے لیے پانچ پانچ ہزار روپیہ پیش کیا اور کہا کہ اپنا آدمی بیچ کر ابھی رقم منگوا لو۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی نے مجھے بتایا کہ وہ ہتھکڑیاں نہیں لگواتے اور رشوت پیش کرتے ہیں۔ میں رات سے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اٹھا۔ حوالات کے دروازے تک گیا۔ دوکانٹیل ہتھکڑیاں لیے کھڑے تھے اور سینہ باہر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے حوالات کے دروازہ کھلوا دیا۔ ہتھکڑیوں والے کانٹیلوں کو اندر لے گیا۔ سیٹھوں سے کہا۔ "آگے آؤ۔ دونوں ہاتھ آگے کرو۔"

انہوں نے منت سماجت کی۔ میں نے آواز دے کر چار کانٹیل بلا لیے۔ انہیں کہا۔ "اگر یہ سیدھے طریقے سے ہتھکڑیاں نہیں پہنتے تو انہیں فرش پر لٹا کر ہتھکڑیاں لگا دو اور گھسیٹ کر کچہری تک لے جاؤ۔" دونوں نے ہاتھ آگے کر دیئے انہیں ہتھکڑیاں لگا کر باہر نکالا گیا۔ میں نے احتیاطاً دو کی بجائے چار کانٹیل ساتھ بھیجے تاکہ راستے میں کوئی لڑکھڑاہٹ نہ ہو۔

اتنے بڑے آدمیوں کے لیے یہی سزا کم نہیں تھی کہ وہ شہر کے ایک عادی مجرم، چرسی اور جواری کے ساتھ ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے شہر میں سے گزارے جا رہے تھے وہ تھانے میں سے نکل گئے تو میں ٹہلٹا ٹہلٹا باہر والے پھاٹک میں جا کھڑا ہوا۔ انہیں جلتے دیکھتا رہا۔ میرے جذبات میں ایسا اُبال آیا کہ میرے آنسو نکل آئے۔ بے گناہ مسلمان لڑکی میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ پونچھو ماری خون جوش میں آگیا۔ میں نے اپنی تھانیداری پر لعنت بھیجی۔ اگر میں تھانیدار نہ ہوتا تو ان دونوں کو قتل کر کے پھانسی چڑھ جاتا۔

اطلاع دے دی۔ وہاں سے مجھے حکم ملا کہ صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ اگر زیادہ گڑبڑ کا خطرہ ہو تو فوراً اطلاع دو اور یہ احتیاط بھی کرو کہ ہندوؤں کے جذبات کو مجروح یا مشتعل نہ کرنا۔

میں نے اُس روز نقب زنی کی تفتیش کی یہ کارروائی کی کوشش کی فوٹو جو سیٹھ کی بیٹی بملا کی کشیدہ کاری کی کتاب سے برآمد ہوئی تھی وہ نکالی۔ اس کے پیچھے اس فوٹو گرافر کی دکان کی مہرگی ہوئی تھی جس سے اس نے تصویر اُتروائی تھی۔ میں نے تصویر اس دکان پر بھیج دی اور کہا کہ اگر اس کا نیکیٹو محفوظ ہو تو آٹھ کا پانچ شام سے پہلے تیار کر دے۔ شام تک مجھے آٹھ کا پانچ مل گئیں۔ میں نے اگلے روز ہیڈ کوارٹر کو یہ تصویریں بھیج کر استدعا کی کہ یہ ملزم اگر ہے اور نقب زنی میں مطلوب ہے، اگر وہ پولیس سے کہا جائے کہ اسے تلاش کرے۔

اُس دور میں پولیس کا نظام صحیح معنوں میں کام کرتا تھا۔ دسویں روز مجھے اطلاع ملی کہ ملزم کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اُسے وہیں رہنے دیا جائے، میں اس کے گھر کی تلاشی لے کر یہاں لاؤں گا۔ ان دس دنوں میں سیٹھوں کے ساتھ جو معرکہ ہوا وہ یوں ہوا کہ ان کے وکیل نے ضمانت کی درخواست دی۔ مجھے طلب کیا گیا۔ ان کے وکیل نے کہا کہ ملزم سیاسی، تجارتی اور معاشرتی تصقوں کے بہت اچھے لوگ ہیں۔ وہ جرمِ پیشہ افراد کے ساتھ تھانے کی غلطی حوالات میں بند ہیں جہاں ان کی حیثیت اور صحت تباہ ہو جائے گی۔ انہیں ایک مسلمان انسپٹر نے مسلمان ہونے کی وجہ سے بے بنیاد الزام میں گرفتار کر لیا ہے۔ لہذا انہیں ضمانت پر رہا کیا جائے۔

میں نے اپنا موقع یہ پیش کیا کہ الزام بے بنیاد نہیں ہے۔ لڑکی کے بیان مجبوری کے روبرو قلم بند اور مزہم ہو چکے ہیں۔ ملزم اثر درسوخ والے لوگ ہیں اور لڑکی

سے بتایا کہ ان سیٹھوں کا جرم کیا ہے۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ لڑکی مجبوری سے اپنے بیان دے چکی ہے۔

میں نے انہیں کہا۔ ”اگر آپ لوگ میرے ساتھ یہ جلوس بازی کریں گے تو پانچ دنوں میں سیٹھوں کا کیس خراب کریں گے کیونکہ میں اوپر اطلاع بھیج کر انگریز پولیس افسروں اور ڈپٹی کمشنر کو بلاؤں گا۔ انہیں جب پتہ چلے گا کہ ان کا جرم کیا ہے تو وہ ذاتی دلچسپی لے کر ان دنوں کو زیادہ سے زیادہ سزا دلائیں گے۔ ابھی لکس میرے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے پاس میرے خلاف لڑنے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ میں ان کے خلاف جو گواہ پیش کروں گا آپ انہیں توڑنے کی کوشش کریں اور میرا استخفا کمزور کریں۔“

ایک لیڈر زیادہ ہی خوشیلا تھا۔ اس نے جوش میں آکر کہا۔ ”ہمیں یہاں مسلمان داروغہ نہیں چاہیے۔“

”یہ آپ بالائی افسروں سے کہیں کہ مجھے یہاں سے ہٹادیں۔“ میں نے کہا۔ ”جب تک مسلمان داروغہ یہاں موجود ہے وہ ان ملزموں کو انتہائی سزا دلانے کی کوشش کرے گا اور بد امنی کو دبانے کے لیے پوری کارروائی کرے گا۔ یہ دنوں اخلاقی ملزم ہیں۔ آپ اپنا جلوس فوراً منتشر کر دیں۔ آپ کے لیے اور ان دنوں کے لیے یہی بہتر ہے۔“

ہندو برٹنی چالاک اور لومڑی طرح مکار قوم ہے۔ وہ مجھے دھمکیاں دیتے ہوئے چلے گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ انہوں نے جلوس سے کیا کہا۔ بہر حال جلوس منتشر ہو گیا۔ رات کو میرے مخیر روزمرہ کی ڈیوٹی دینے آئے تو انہوں نے بتایا کہ شہر میں میرے خلاف بہت شور اٹھ رہا ہے اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ مسلمان داروغہ نے نقب زنی کے مجرموں کو بچانے کے لیے سیٹھ کو گرفتار کر لیا ہے۔ میں نے احتیاطاً اپنے بالائی افسروں کو بریلیوٹیلیفون

پلے آسرا ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ ملزم تفتیش میں رکاوٹ ڈالیں گے اور لڑکی کو پریشان کریں گے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ملزم ابھی حوالات میں ہیں لیکن شہریوں نے ان کے حق میں تین ہزار نفوس کا جلوس نکالا اور تھانے پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہے جس کی رپورٹ متعلقہ اتھارٹی کو دے دی گئی ہے۔ اگر ملزم ضمانت پر رہا ہو گئے تو شہز میں نقص امن کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ یہ دونوں اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنی گرفتاری کو سیاسی مسئلہ بنا دیں گے۔

مجھ ٹریٹ نے ضمانت کی درخواست مسترد کر دی۔ ان کے وکیل نے ضلع میں جا کر سیشن کورٹ میں ضمانت کی درخواست دی۔ وہ بھی میرے دلائل کے سامنے بے اثر رہی اور مسترد کر دی گئی۔ سات روز کا ریمانڈ ختم ہو گیا تو میں نے مزید ریمانڈ دیا کیونکہ مجھے ملزموں کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں جوڈیشل حوالات (جیل) بھیج دیا گیا۔ وہاں جا کر آٹھویں روز جانی کورٹ نے انہیں ضمانت پر رہا کر دیا۔

بملا شکیلہ بن گئی

میں اگر گیا۔ مسلمان منشی ایک تھانے کی حوالات میں بند تھا۔ میں نے نوٹس سے اس کا چہرہ ملایا۔ نام پوچھا۔ ولدیت پوچھی اور یقین کر لیا کہ یہی منشی ہے۔ اس نے وہاں میناری کی دکان کھول لی تھی۔ وہ اسی دکان سے گرفتار کیا گیا تھا۔ میں نے قانون کے مطابق اس کے گھر کی تلاشی لی۔ سیٹھ کی بیٹی بملا گھر میں تھی۔ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ میں جب وہاں کے تھانیدار کے ساتھ اس کے گھر میں داخل ہوا اور اس نے منشی کو ہتھکڑیوں میں

دیکھ تو اس کا رنگ اڑ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”تمہارا نام بملا ہے؟“

”نہیں“ اس نے جواب دیا۔ ”اب میرا نام شکیلہ ہے۔“

”مسلمان ہو گئی ہو؟“

”ہاں“

”سیٹھ کی بیٹی ہو؟“

”ہاں۔ اس نے کہا۔“ اب اس رمنشی کی بیوی ہوں۔“

میں نے دونوں سے کہا۔ ”میں تمہیں جیسے کہوں ویسے کرو۔ مجھے پریشان کرو گے تو بہت پریشان ہو گے۔ میری مانتے جاؤ گے تو فائدے میں رہو گے۔۔۔ سیٹھ کے گھر سے جتنا مال نکالا ہے وہ خود ہی نکال دو۔ منشی نے پس و پیش کی۔ لڑکی خاموش ہو گئی۔ میں نے منشی سے کہا۔

”اب تمہاری ہیرا پھری بیکار ہے۔ تمہارا ایک ساتھی پکڑا گیا ہے۔ ثبوت مل گیا ہے۔“

”کونسا ساتھی؟“ منشی نے پوچھا۔

”جس کا کنڈھا اینٹ کے کونے سے کٹ گیا تھا“ میں نے کہا۔ اُس کا نام بتاؤں؟“

”اندھ چلے۔“ منشی نے کہا۔ پھر اس نے بیوی کو اشارے سے بلایا اور کہا۔ ”ٹرنک

کھول دو۔“

تشکیلہ (سابقہ بلا) نے زیورات اور رمنشی کپڑے نکال دیئے۔ زیورات ایک کپڑے میں بندھے ہوئے تھے۔ ان کے ڈبے یہ لوگ مکان کے باہر پھینک آئے تھے۔ نقدی مرٹ گیارہ ہزار ملی۔ منشی نے بتایا کہ چھتیس ہزار تھی۔ اس میں سے پندرہ ہزار دکان میں

رہا۔ پہلے داروغہ کو میں معطل کر اچکا ہوں اور اس کے خلاف انگواری ہو رہی ہے اور میری طرف میری رشتش کا نتیجہ ہے۔ میں نے ٹیکیلہ سے پوچھا۔ ”اپنے باپ کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟“

”میں کہتی ہوں کہ اُسے پرسوں مرنا ہے تو ابھی مر جائے۔“ ٹیکیلہ نے کہا۔ ”اُس شہزادے کی میری ماں کو ہمیشہ پریشان رکھا پھر اس کی بہن کو اغوا کر لیا۔“

”آپ کو میری بہن کا سراغ کس طرح ملا تھا؟“ نشی نے کہا۔ ”میں آپ کی بات پر یقین نہیں کر سکتا اور اس پر تو میں یقین کر ہی نہیں سکتا کہ آپ نے سیٹھ کو گرفتار کر لیا ہے۔“

میں نے اسے اس کی بہن کا نام بتایا۔ دونوں بتائیں۔ مختصر یہ کہ میں نے اسے منوایا کہ اس کی بہن کو میں برآمد کر چکا ہوں۔ ایک تھانیدار کو قطعاً ایسی ضرورت پیش نہیں آئی چاہیے تھی کہ ملزم کے ساتھ اس قسم کی باتیں کرے لیکن مجھے یہ ضرورت اس لیے پیش آ گئی تھی کہ میں نشی کو اس کی بہن کی خاطر اور اس لڑکی کی خاطر جس نے اس کے لیے اپنا مذہب بھی

چھوڑ دیا تھا، بچانا چاہتا تھا۔ میرے ذہن اور دل پر نشی کی بہن کی بے ابروئی سوار تھی۔ میری ساری توجہ سیٹھ پر لگی ہوئی تھی۔ اسی جذبے کے تحت میں نشی کو ایک راستہ دکھانا چاہتا تھا یہ تو اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ میں نے اسے نقب زنی کے بعد کی وہ ساری

کارروائی سنائی جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ میں نے جب اس کی بہن کا حال سنا تو نشی اور ٹیکیلہ کے آنسو بہ نکلے۔ میں نے نشی سے کہا کہ مجھے اصل واقعہ پوری تفصیل سے سنا دو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ تمہیں میں کس طرح بچاؤں گا۔“

لگا دی ہے اور باقی حصہ داروں کو دسے دی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ نشی نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔ میں نے تاشی کی مزید کارروائی پوری کی۔ وہاں کے دو مشیروں کے برآمدگی پر دستخط کیے اور ٹیکیلہ کو بھی حراست میں لے لیا تاکہ مال اس کے قبضے سے برآمد ہوا تھا۔ اگر وہ سیٹھ کی بیٹی نہ ہوتی یعنی نقب زندہ گھر کی فرزند ہوتی تو اس کی گرفتاری کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں نے اُسے اعانتِ جرم میں حراست میں لیا تھا۔

ریل گاڑی میں میں نے ایک چھوٹا کپار ٹمنٹ خالی کر لیا کیونکہ میرے ساتھ ملزم تھے۔ سفر چھ سات گھنٹوں کا تھا۔ میرے ساتھ دو کانٹیل تھے۔ دونوں مسلمان تھے۔ گاڑی چلی تو میں نے کانٹیلوں کو دوسری سیٹ پر بھیج کر نشی اور ٹیکیلہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ ٹیکیلہ کے آنسو بہ رہے تھے۔ میں نے اُسے تسلی دی اور اُن دونوں سے کہا۔ ”پہلے میری بات سن لو تاکہ تمہارا خون دُور ہو جائے۔ میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا۔“

نشی واقع ذہین اور تیز آدمی تھا۔ فوراً بولا۔ ”آپ کو ہمارے ساتھ کیا بھد ر دی ہو سکتی ہے؟ آپ سیدھے کہیں کہ اقبال جرم کر لو۔ آپ نے مال برآمد کر لیا ہے جو ساتھ جا رہا ہے۔ اب یہ میری مرضی ہے کہ اقبال جرم کروں یا نہ کروں۔ آپ اپنا کیس بنا لیں۔ وہ چُپ ہو گیا۔ میں ابھی بولا نہیں تھا کہ اس نے سخت غصے میں کہا۔ ”آپ کو یہ معلوم نہیں کہ سیٹھ نے میری کنواری بہن اغوا کرادی ہے اور آپ سے پہلے جو داروغہ تھا اس نے مجھے بے عزت کر کے تھانے سے نکال دیا تھا۔“

”تمہاری بہن کو میں نے برآمد کر لیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے بیان مجھٹ کے سامنے قلم بند کر دیا ہے۔“ سیٹھ کو ایک اور سیٹھ کے ساتھ گرفتار کر لیا ہے۔ ان کے ساتھ ایک اور ملزم بکڑ رکھا ہے۔ وہ سب جیل میں ہیں۔ میں ان کی ضمانت نہیں ہونے دے

بیٹی کا انتقام بہن سے لیا

بول رہا ہے۔ سیٹھانی چپ سی ہو گئی۔ بلال نے غصتے میں اپنے باپ کے خلاف دوچار باتیں کیں۔ سیٹھانی پہلے ہی سیٹھ کے بڑے سلوک سے تنگ تھی۔ منشی نے نوکر کو باہر لے جا کر ڈرایا دھمکایا اور کہا کہ وہ اسے قتل کر دے گا۔

نوکر ڈر گیا۔ اس نے منشی کے آگے ہاتھ جوڑے اور کہا۔ "میرا تمہاری بہن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بتا دیتا ہوں کہ اسے سیٹھ نے غائب کر لیا ہے۔ مجھے یہ پتہ نہیں کہ کس طرح اور کہاں غائب کیا ہے۔" نوکر نے ادھا جھوٹ اور ادھا سچ بول کر اپنی جان چھڑالی۔ منشی نے اندر جا کر سیٹھانی اور بلا کو بتایا کہ نوکر نے کیا انکشاف کیا ہے۔ منشی سیٹھ کے پاس چلا گیا۔ سیٹھ کے سامنے منشی کی کیا حیثیت تھی؟ اس نے منشی سے کہا۔ "اب تم سمجھ جاؤ گے کہ دوسروں کی بیٹیوں کو خراب کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ ڈھونڈو اپنی بہن کو۔"

منشی تھانے گیا۔ تھانیدار ہندو تھا۔ اسے رپورٹ دی۔ جب اسے یہ بتایا کہ فلاں سیٹھ نے اس کی بہن غائب کر لی ہے تو تھانیدار نے ٹال مٹول شروع کر دی۔ پھر اسے ڈانٹ دیا۔ آخر یہ کہا کہ تمہاری بہن اپنی مرضی سے گئی ہے۔ جاؤ، پہلے یہ پتہ کرو کہ وہ کہاں ہے پھر آ کے مجھے بتانا۔ منشی نے رپورٹ درج کرانے پر اصرار کیا تو تھانیدار نے ایک کانٹیل کو بلا کر کہا۔ "اسے حالات میں بند کر دو اور جو مال اس روز برآمد ہوا تھا وہ اس کے نام جوڑ دو۔" دوکانٹیل منشی کو گھیسٹے لگے اور حالات کے دروازے کے سامنے جا کھڑا کیا۔ وہاں اسے کہا گیا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے اور پھر کبھی تھانے میں نہ آئے۔

وہ پھر سیٹھ کی دکان پر گیا۔ خاصی گرما گرمی ہوئی جس کے بعد سیٹھ نے اسے نوکری سے الگ کر دیا۔ منشی نے اسے دھکی دی اور چلا گیا۔ وہ سیٹھ کے گھر گیا۔ اتفاق سے سیٹھانی گھر نہیں

اس نے جو قصہ سنایا وہ مختصراً اس طرح ہے کہ وہ سیٹھ کا منشی تھا اور اس کے گھر بھی جایا کرتا تھا۔ سیٹھ کے بچے بڑے ہوئے تو وہ شام کے وقت انہیں پڑھانے کے لیے جانے لگا۔ سیٹھ کی لڑکی بملا (سکیڈ) اسے پسند کرنے لگی۔ گھر کے بہت سارے کمرے تھے۔ وہ نظر بچا کر راز و نیاز کی باتیں کر لیتے تھے۔ ان کی محبت پروان چڑھتی رہی اور وہ دن آیا جب سیٹھ اور سیٹھانی نے انہیں موثر پر یکٹڑ دیا۔ منشی کو سیٹھ نے نوکری سے جواب نہ دیا۔ اس کے دل میں انتقام کا ارادہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے منشی سے کہا کہ وہ جعانی مانگ سے وراسے نوکری سے نہیں نکالا جائے گا۔ منشی نے جعانی مانگ لی۔

دو دن بعد منشی شام کے وقت اپنے گھر گیا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے اڑدس پڑدس بیس اپنی بن کوڑھونڈا۔ وہ کہیں بھی نہ ملے۔ محلے کے ایک آدمی نے اسے بتایا کہ اس نے سینو کے نوکر کو اس کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ ایک عورت نے اسے بتایا کہ اس نے لڑکی کو باہر تالا لگاتے دیکھا تھا اور اس سے پوچھا تھا کہ اہل جا رہی ہو؟ اس نے بتایا تھا کہ جعانی لڑکے کے گھر لہا رہا ہے۔ اس عورت نے ایک ہندو کو برسے کھڑے دیکھا تھا جسے وہ نہیں جانتی تھی۔

منشی بیٹے کے گھر گیا۔ بیٹے کے گھر نہیں تھا۔ اس نے سب کو بتایا اور اس کی بیٹی بھلا کو بتایا کہ اس کی بہن بے روزگار ہے اور محلے کے لادڑوں نے بتایا ہے کہ ان کا نوکر اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نوکر سے پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ منشی نے کچھ بتایا کہ نوکر کا اندازہ بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ

پٹیا۔ میں سمجھ گئی کہ اس نے لڑکی کو کہیں رکھا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہر شام عیش کرتا ہے۔ میں اپنی ماں کی بے عزتی، اپنی بے عزتی اور اپنی سہیلی کی بے عزتی کا انتقام لینے پر اتر آئی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اس کے ساتھ گھر سے بھاگ جاؤں گی اور مذہب بھی تبدیل کر دوں گی۔ میں نے بدلے لینے کا یہی طریقہ اختیار کیا کہ اپنے آپ کو اس آدمی (منشی) کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔“

فرار اور لقب زنی

دونوں جوان تھے۔ جذبات نے ان کی عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ منشی کی آنکھوں میں خون چڑھا ہوا تھا۔ اگر بلا اس کے ساتھ بھاگنے کا پروگرام نہ بناتی تو منشی سیدڑ کو قتل کرنے کا پلہ گرام بنا چکا تھا۔ بہرحال انہوں نے نتائج کی پروا نہ کی۔

ایک دو دن بعد وہ پھر ملے اور فرار کا پروگرام طے ہو گیا۔ بلا شام کے بعد چوری چھپے گھر سے نکلی اور منشی کے گھر پہنچ گئی۔ اس نے چادر میں اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا اور اس چادر میں اس نے ساٹھے تین ہزار روپیہ بھی چھپا رکھا تھا۔ یہ رقم وہ اس رقم میں سے نکال لاتی تھی جو بعد میں لقب زنی میں گھر سے نکل گئی تھی۔ سیٹھ کا روپیہ بنگ میں جاتا تھا لیکن جنگ عظیم کی وجہ سے وہ بہت سی نقدی گھر میں بھی رکھا تھا۔ جنگ کے دوران اکثر تاجروں نے بنکوں سے رقمیں نکلوانی تھیں کیونکہ سب کو یہ ڈر تھا کہ جاپانی ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے۔ ایک افزہ یہ بھی پھیل گئی تھی کہ انگریزوں کو پیسوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے بنکوں میں لوگوں کا جو روپیہ جمع ہے اس پر انگریز قبضہ کر لیں گے۔ نوٹوں کے انہی بنڈوں میں سے بلا نے کچھ نوٹ

منشی نے ہلاک بتایا کہ اس کے ساتھ تھا نے میں کیا سلوک ہوا اور سیٹھ نے اسے کیا کہا ہے اور اسے نوکری سے بھی نکال دیا گیا ہے۔ بلا بھڑک اُٹھی۔ اس نے منشی سے کہا کہ وہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ اس کے باپ نے منشی کی بہن کو اتنا اغوا کر لیا ہے۔ بلا سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے منشی سے کہا کہ کل فلاں وقت فلاں جگہ ملے۔

اگلے روز منشی اور بلا کی گھر سے فرار اور ملاقات ہوئی۔ بلا نے منشی کو بتایا کہ رات اس نے اور اس کی ماں نے سیٹھ سے کہا کہ منشی کی بہن کو اس نے اغوا کر لیا ہے۔ اسے گھر بھیج دے۔ سیٹھ شراب پیئے ہوئے تھا۔ اس نے سیٹھانی اور بلا کو خوب پٹیا اور نشے میں یہ بھی بتا دیا کہ لڑکی کو اسی نے اغوا کر لیا ہے۔ جس میں ہمت ہے وہ مجھ سے لڑکی چھڑانے آجائے۔ یہ دراصل شراب کا نہیں، دولت اور اثر و رسوخ کا اثر تھا اور یہ بھی کہ لڑکی مسلمان تھی۔ غریب تھی اور وہاں مسلمانوں کی کوئی رسائی اور شنوائی نہیں تھی۔

بلا نے منشی سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کو تیار ہے۔ وہ کچھ رقم بھی گھر سے لے آئے گی لیکن اس شہر سے نکلنا ہوگا۔ مختصر یہ کہ بلا نے منشی کے ساتھ بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا۔ اس ارادے کے پیچھے منشی کی محبت بھی تھی اور اپنے باپ کے خلات انتقامی جذبہ بھی۔ اس جذبے کو بلا نے میرے سامنے یوں بیان کیا۔ ”اس کی بہن میری سہیلی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے باپ نے اسے اس لیے اغوا کر لیا ہے کہ اس نے مجھے اس (منشی) کے پاس ایک ہی صوفے پر اس طرح بیٹھے دیکھ لیا تھا کہ میرا بازو اس کے کندھے پر تھا اور اس کا بازو میری کمر کے گرد تھا۔ میرے باپ نے اس کا بدلہ لینے کے اس کی بہن کو اغوا کر لیا۔ میں اپنے باپ کے اخلاق سے واقف ہوں۔ اس لڑکی کے بعد اس کا گھر میں روپیہ اور زیادہ خراب ہو گیا تھا۔ اس نے میری ماں کو پٹیا، مجھے

چڑھائے۔ زیادہ اس لیے نہ اٹھائے کہ گھروالوں کو شک نہ ہو۔

منشی منظر تھا۔ آگرہ ہانے کا فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ منشی کا سکول کے زلزلے کا ایک ہم جماعت اور دوست آگرہ میں ملازم تھا۔ ان کی دوستانہ خط و کتابت یہی تھی۔ منشی نے بلا کو دیکھتے ہی گھر کو تالے لگائے۔ ریل گاڑی کا کوئی وقت نہیں تھا۔ زیادہ انتظار مناسب نہیں تھا۔ پکڑے جانے کا خطرہ تھا۔ منشی نے سامان باندھ رکھا تھا۔ بلا کو ساتھ لے کے بس اڈے پر پہنچا اور بس سے شہر سے نکل گئے۔ پچاس میل دور ایک جنکشن ریلوے سٹیشن پر اترے جہاں سے نصف گھنٹہ بعد انہیں آگرہ کی ریل گاڑی مل گئی۔

اس گاڑی سے انہیں آگرہ پہنچا دیا۔ وہ دوست کے پتے پر اس کے گھر پہنچ گئے۔ دوست نے انہیں پناہ دی۔ اس کا یہ دوست کچھری میں ملازم تھا۔ اس کے اثر و رسوخ سے منشی کو ایک دکان مل گئی جس میں اس نے تقریباً تین ہزار کا مال رکھ لیا۔ پھر بلا ایک مولوی کے سامنے مسلمان ہو کر تشکیل بن گئی اور اسی مولوی نے چند افراد کو مسجد میں بلا کر منشی اور تشکیل کا نکاح پڑھا دیا۔ کسی کے مشورے پر مجھڑیٹ سے تشکیل کے بیان قلمبند کر لیے گئے کہ وہ بالغ ہے۔ اپنی مرضی سے اس آدمی کے ساتھ آئی ہے اور آزادانہ مرضی سے اسلام قبول کر کے اس کے ساتھ شادی کی ہے۔

منشی اپنی بہن کو نہیں بھول سکتا تھا۔ بعض اوقات وہ رو بھی پڑتا تھا۔ اس مختصر سے عرصے میں وہ دوبار اپنے شہر میں گیا اور رات کے وقت اپنے گھر کو جا کر دیکھا۔ وہاں بدستور تالا لگا ہوا تھا۔ اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑکتی رہی۔ ایک روز اس نے تشکیل سے بات کی کہ وہ انتقام لینا چاہتا ہے۔ کئی طریقے زیر غور آئے۔ آخر تشکیل کی یہ تجویز ملے پانی کے سیٹھ کا مال دولت اڑایا جائے۔ منشی سیٹھ کے گھر کے سارے کمروں سے اچھی طرح واقف تھا۔ ٹرنگوں

کے متعلق اسے شکیلد نے بتایا کہ کس ٹرنگ میں کیا ہے اور مطلوبہ ٹرنگ۔ کہاں کہاں رکھے ہیں۔ اس تجویز کے تحت منشی اپنے شہر میں گیا اور اپنے جرائم پیشہ دوستوں کے ہاں پناہ لی۔ اس نے دو آدمی اپنے ساتھ تیار کر لیے جن میں ایک وہ تھا جس کا کندھا زخمی ہو گیا تھا۔ وہ میری حوالات میں بند تھا۔ وہ نقب زنی کے فن سے واقف تھا۔ اس نے شہر سے چھ میل دور سے ایک ماہر نقب زن بلا لیا۔ واردات کے وقت منشی ان کیساتھ تھا۔ نقب لگائی گئی۔ منشی ان کے ساتھ اندر گیا اور وہی دو ٹرنگ اور ایک ایچی کیس اٹھوایا جن کی نشاندہی شکیلد نے کی تھی۔ وقت رات کے اڑھائی بجے تھا۔ سہل آدمی جو اندر گیا وہ یہ زخمی ملزم تھا۔ اینٹ کے کونے نے اس کا کندھا چیر دیا۔ وہ پیچھے بٹا اور سلاح مار کر کونہ توڑ دیا۔ یہی وہ کونہ تھا جو میں نے موقع واردات سے اٹھایا اور ملازم کو پکڑا تھا۔ ٹرنگ اور ایچی کیس باہر لاکر انہوں نے نقدی، زیورات اور ریشمی کپڑے ایچی کیس میں ڈالے۔ زیورات کے ڈبے پھینک دیئے گئے تھے۔ دونوں ملزموں نے اپنا اپنا حقہ وصول کیا اور منشی ایچی کیس اٹھاتے ریلوے سٹیشن پہنچا۔

ریل گاڑی خاصی دیر بعد آئی اور وہ آگرہ روانہ ہو گیا۔ شکیلد اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ دوسرے دن منشی نے بہت سا مال خرید کر دکان میں بھر لیا۔ انہیں ڈرہ بھر شک نہ تھا کہ وہ پکڑے جائیں گے۔ منشی نے اپنے دونوں خطوں کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ پہلا خط پوسٹ کرنے کے چند دن بعد وہ رات کے وقت اپنے شہر گیا اور گھر جا کر دیکھا تھا کہ اس کی بہن گھر آئی ہے یا نہیں۔ پھر اس نے دوسرا خط لکھا اور اس کے بعد یہ واردات کی اس نے کہا۔ اس کے بعد میرا پر دو گرام یہ تھا کہ سیٹھ کے گھر کو آگ لگاؤں گا اور اس کے بعد سیٹھ کو قتل کرنے کا پروگرام تھا۔

کہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے یہ بیان دے کہ تمنا دینا مجھے ڈرا تا رہا ہے اور کانٹیلوں سے مجھے بے آبرو کرانے کی دھمکیاں دیتا رہا ہے۔ میں فلاں سیٹھ کی بیٹی ہوں، اگر وہ فلاں مجسٹریٹ کے سامنے بیان دے چکی ہوں۔ میں اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی۔ مسلمان ہوئی اور اس کے ساتھ شادی کی ہے۔ میرے باپ نے انتقام کے لیے ہمیں گرفتار کرایا ہے۔

میں نے انہیں سات روز کے ریمانڈ پر حوالات میں رکھا۔ پھر مجسٹریٹ کے پاس اقبالی بیان کے لیے لے گیا۔ منشی بہت چالاک آدمی تھا۔ اُس نے ایک دلچسپ حرکت کی۔ وہ جرنہی مجسٹریٹ کے سامنے گیا تورا کرگرا اور بے ہوش ہو گیا۔ دوسرا ملزم سر سرکڑ کر بیٹھ گیا اور سکیڈ نے رونا شروع کر دیا۔ اور یوں مجسٹریٹ کو یہ تاثر دیا کہ پولیس نے انہیں اذیتیں دے دے کہ بے حال کر دیا ہے۔ منشی پانچ منٹ بعد ہوش میں آ گیا۔ مجسٹریٹ انہیں جیمبر میں لے گیا۔ میں کانٹیلوں کے ساتھ باہر منتظر کرتا رہا۔

اُدھے ہی گھنٹے بعد مجسٹریٹ نے باہر آکر مجھے اطلاع دی۔ ”ملزموں کو میں جوڈیشل لاک آپ رجیل، میں بھیج رہا ہوں۔ اقبالی بیان نہیں ہو رہا ہے۔ مجھے یہی توقع تھی۔ یہ قانونی طریقہ تھا۔ تینوں جیل چلے گئے۔ جیل خانے کی معرفت انہوں نے وکیل کیا۔ اُس نے تینوں کی ضمانت کی درخواستیں دیں۔ میں نے مخالفت نہ کی۔ تینوں ضمانت پر رہا ہو گئے۔

انصاف کا درگھلا

میں نے شہادت تیار کرنے میں جو استادیاں کیں وہ میں آپ کو نہیں سنانا

یہ ظاہر ہے کہ میں نقب زنی کے مجرموں کو بخش نہیں سکتا تھا لیکن میں صرف تمنا دینا نہیں مسلمان بھی تھا جسے ہندوؤں نے صرف اس لیے لکارا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ مجھے ایک ہندو لیڈر نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمیں مسلمان داروغہ نہیں چاہیے۔ ہندوؤں نے اسلام مردہ باد کا نعرہ بھی لگایا تھا۔ ہندو سیٹھوں نے ایک معصوم لڑکی کو پورا ایک ہسپتہ عیاشی کا ذریعہ بنا کر رکھا تھا۔ مجھے اس کا بھی انتقام لینا تھا۔ مجھے شکیلہ کا تحفظ بھی کرنا تھا جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اپنے شرابی، عیاش اور ہندو باپ سے انتقام لینے کی کوشش کی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایک ہندو لڑکی کی ایک مسلمان لڑکی کی بے عزتی کا انتقام اپنے باپ سے لے سکتی ہے تو میں تو مسلمان ہوں اور مرد ہوں۔ جہنم میں جائے تمنا دینا رہی۔

میں نے منشی کو لمبا چوڑا سینٹ پر پٹھایا۔ شکیلہ کو بھی بہت سی باتیں سمجھائیں اور انہیں کہا کہ میں انہیں سزا سے بچاؤں گا۔ میرا سینٹ محض راہ تھا منشی سے میں نے کہا کہ وہ تیرے ملزم کی نشاندہی نہ کرے۔ یہ خواہش ظاہر کرے کہ میں اقبال جرم کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے سامنے رنجھی، ملزم سے بھی یہی کہلائے۔ میں انہیں مجسٹریٹ کے پاس لے جاؤں گا اور اسے کہوں گا کہ ان کے اقبالی بیان قلمبند کیے جائیں۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مجسٹریٹ ملزموں کو اپنے جیمبر میں بیٹھا کر پولیس کو باہر نکال دیتا ہے اور ملزموں سے کہتا ہے کہ وہ اقبالی بیان دیں یا نہ دیں وہ آزاد ہیں۔ اگر ملزم اقبال جرم نہ کرنا چاہیں تو انہیں پولیس کے حوالے نہیں کیا جاتا بلکہ جیل کی حوالات میں بھیج دیا جاتا ہے۔

میں نے منشی سے کہا کہ جب وہ مجسٹریٹ کے پاس جائیں تو وہاں کہہ دیں کہ تمنا دینا ہم پر بے رحمی سے تشدد کرتا رہا ہے جس سے تنگ آکر ہم نے کہا ہے کہ ہم اقبالی بیان دینا چاہتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں نے شکیلہ سے کہا

اس کے ساتھ ہی ایس پی صاحب کے حکم کے مطابق میں نے پہلے ہندو تھا نیرا کے خلاف بھی شہادتیں اکٹھی کر لیں۔ اُس نے منشی کی یہ رپورٹ رجسٹر نہیں کی تھی کہ اُس کی بہن لاپتہ ہو گئی ہے۔ منشی وغیرہ کے صفائی کے وکیل نے منشی کی بہن کے اغوا وغیرہ کو سیٹھ کے خلاف نہایت قابلیت سے استغوا کیا۔

شکیلدے نے جب آخر میں بیان دیا تو میں بھی کانپ اٹھا۔ بیٹی نے باپ کو ایسی بے دردی سے شکا کیا کہ مجھ سیٹھ نے بھی قلم منہ میں ڈال لیا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ میرا باپ میری ماں کے ساتھ بہت بڑا سلوک کرتا تھا۔ اُسے خرچ کے لیے کوئی پیسے نہیں دیتا تھا۔ میں اس کی بیٹی ہوں۔ اپنے گھر سے پوری طرح واقف تھی۔ میرا باپ گھر میں کوئی رقم نہیں رکھتا تھا۔ ہمارے گھر میں اتنی رقم کبھی آئی نہیں جتنی یہ بتاتا ہے کہ پوری ہوتی ہے۔ اسے میری ماں کی بجائے گھر کے نوکر پر بھروسہ تھا۔ وہ اسے گھر کا خرچ دیا کرتا تھا۔ یہی وہ نوکر ہے جن نے میرے خاوند کی بہن دھوکے سے اغوا کر کے اس کے حوالے کی تھی۔ مجھے اپنے خاوند (ملزم) سے محبت ہے یا نہیں، میں گھر سے اپنے باپ کی کوتاہی اور ظلم و تشدد سے بھاگی تھی“

مجھ سیٹھ نے عدالتی جرح کے دوران شکیلدے پر سوال کیا: ”کیا شادی سے پہلے ملزم کے ساتھ تمہارے ناجائز تعلقات تھے؟“

”جی ہاں“ شکیلدے نے دلیری سے جواب دیا اور اضافہ کیا۔ ”باپ نے ایک بار ہمیں موقع پر پکڑ لیا تھا۔ اس کا انتقام لینے کے لیے اس نے میرے خاوند کی بہن کو اغوا کر لیا اور اب انیسٹر احمد یار خان کو رشوت دے کر ہم دونوں کو آگرہ سے گرفتار کر دیا ہے۔“ صفائی کے وکیل نے مجھ سیٹھ کے اس سوال اور شکیلدے کے جواب کو نہایت پاکوستی

چاہتا کیونکہ آپ بورہوں گے۔ ان تفصیلات کو صرف پولیس والے سمجھ سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ میں نے شہادت اس طرح تیار کی جس سے یہ بھی ظاہر نہ ہو کہ میں ملزموں کی مدد کر رہا ہوں یا ناٹادی ہوں یا رشوت لی ہے۔ میں نے ایسی خامیاں چھوڑ دیں جو شک پیدا کرنے کے لیے کافی تھیں۔ منشی وغیرہ کو میں نے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ کیس کورٹ میں گیا۔ میں نے شہادتیں پیش کیں اور یہ منظر دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی کہ سیٹھ گواہی دیتے آیا تو اس کی اپنی بیٹی ملزموں کے کپڑے میں بیٹی ہوئی تھی۔

بیٹی کی طرف سے وکیل نے سیٹھ پر جرح شروع کی تو وہ اس قدر توہین آمیز اور شرمناک تھی کہ ایک موقع پر سیٹھ نے چلا کر مجھ سیٹھ سے کہا۔ ”میں بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایسے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔“ لیکن اسے جواب دینے پڑے۔

سیٹھ کی پوزیشن کو میں نے اس طرح کمزور کر دیا کہ رات رات بیٹھ کر مسلمان لڑکی کے اغواء جس بیجا اور ابروریزی کا مقدمہ اُس کے خلاف قائم کیا اور گواہ اکٹھے کر لیے جن میں زیادہ تر گواہ میرے پڑوساے ہوئے تھے۔ سیٹھ کے نوکر کو بھی میں نے گرفتار کر لیا۔ لڑکی کے پڑوس کے تین مسلمان یہ ثابت کرنے کے لیے تیار کر لیے کہ انہوں نے نوکر کو دیکھا تھا کہ لڑکی کے گھر گیا اور اسے ساتھ لے گیا۔ دو گواہ لڑکی کو اُس مکان میں داخل کرنے کے ثبوت کے لیے تیار کیے۔ اور اس طرح بہت سی شہادت اکٹھی کر لی۔ میرے مشافحہ کے مسلمان افراد نے ہندو سے۔ ایس۔ آئی کو پتہ نہ چلنے دیا اور جھوٹے گواہ لانے میں میری بہت مدد کی۔ ڈاکٹر کی رپورٹ ثابت کر رہی تھی کہ لڑکی جب اس کے پاس لے جاتی گئی تو تھوڑی دیر پہلے اس کی ابروریزی ہوئی تھی اور ابروریزی اس سیٹھ نے کی تھی۔ غرض میرا مقدمہ بڑا ہی مضبوط تھا۔

سے اپنی آخری جرح میں استعمال کیا۔ بہر حال عدالت کے اندر بڑے کچھ ہوا وہ اس قدر دلچسپ اور سنسنی خیز تھا کہ میں اس کی پوری کتاب لکھ سکتا ہوں۔ مجسٹریٹ اتنا چکا رہا کہ اس نے کیس سیشن جج کے سپرد کر دیا۔ وہاں پھر دہی ہنگامے ہوئے اور آخر سیشن جج نے تینوں ملزموں دمنشی، شکیلہ اور زخمی ملزم، کو صاف بری کر دیا۔ فیصلے میں جج نے میرے خلاف بھی ہلکے سے دیکھا کس لکھے۔

اس کیس کے ساتھ ساتھ دونوں سیٹوں کے خلاف دمنشی کی بہن کا کیس چل رہا تھا۔ اس کیس کی کامیابی کے لیے میں نے بڑی دماغ سوزی کی تھی۔ یہ کیس بھی سیشن کورٹ میں گیا۔ تین ماہ بعد شکیلہ کے باپ کو تین دفعات میں سزائیں سنانی گئیں۔ اغوا، تین سال۔ آبروریزی، پانچ سال۔ حبس، بیجا، تین سال۔ اور مزے کی بات یہ ہوئی کہ جج نے لکھا کہ یہ سزائیں ایک دوسری کے بعد شروع ہوں گی۔ عموماً ایسی سزائیں اکٹھی شروع ہوتی ہیں لیکن سیشن کورٹ کے لیے اندر چلا گیا۔ دوسرا سیشن دو سال کے لیے اندر ہوا۔ پہرہ دار اور نوکر کو دو دو سال سزائے قید دی گئی۔ انہوں نے اپیل کی جو ہائی کورٹ نے مسترد کر دی۔ پہے ہندو پولیس انسپکٹر کے خلاف محکمانہ کارروائی ہوئی۔ میں نے اسے بھی پوری طرح کامیاب کیا۔ اس ہندو کو ایس پی کی کوششوں سے نوکر کی سے ہی برطرف کر دیا گیا۔ دمنشی اور شکیلہ اگرچہ چلے گئے اور اپنی بہن کو بھی ساتھ لے گئے۔

جرم و سزا کے موضوع پر احمد یار خان کی ہمیشہ زندہ رہنے والی کہتا ہیں

جب مجھے اغوا کیا گیا

دلیر یا بیوقوف؟

کارنٹلو اور دو سٹم

بال ایک چڑیل کے

دوسری بیوی

ملاقات اس مکان میں

جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں

جنات کے دربار میں

ایک سات کی شادی

جب کالا رعب حل ہاتھا

سندری کا سودا

روح کے رشتے

لاش لڑکی اور گھٹ گھنا بھکار

واردات اس سات کی

پیار کا نپل صراط

داستان ایک ماد کی

قاضی کی کوٹھڑی اور کنواری بیٹی

جب پیار نے کروٹ بدلی

رات کا راز

دام میں سیاد آگیا